اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جون ۲۰۲۳ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 Monthly Al Burhan June 2023

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لاہور انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز کے زیر اہتمام

گرمیوں کی چھٹیوں میں 'قرآنی عربی' اور 'اسلام اور عصری مسائل' کے

سہ ماہی شارٹ کورسز

5 جون تا 2 ستمبر 2023ء

فزیکل و آن لائن

بلا معاوضہ

برائے رجسٹریشن

ermpak@hotmail.com

0336-1913636

0300-4107282

کامیاب شرکاء کو سرٹیفکیٹ دیئے جائیں گے۔

کورس نمبر 1

پیر، منگل، بدھ 6:00 تا 7:00 بعد عصر

تدریس: حافظ محمد عمران طحاوی (پی ایچ ڈی سکالر)

قرآنی عربی

کورس نمبر 2

Monday پیر 7:30 تا 8:30 بعد مغرب

اسلام اور عصری مسائل۔ تدریس: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

اسلام اور مغربی فکر و تہذیب

کورس نمبر 3

Tuesday منگل 7:30 تا 8:30 بعد مغرب

اسلام اور عصری مسائل۔ تدریس: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

اسلام، مغرب اور ہمارے سیاسی مسائل

کورس نمبر 4

Wednesday بدھ 7:30 تا 8:30 بعد مغرب

اسلام اور عصری مسائل۔ تدریس: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

اسلام، مغرب اور ہمارے تعلیمی مسائل

جامعہ رحمانیہ 65 ٹیپو بلاک

نزد برکت مارکیٹ نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

ماہنامہ
البرہان لاہور
جلد ۲۷، شمارہ ۶، جون ۲۰۲۳ء/ ذی القعدہ ۱۴۴۴ھ

مشمولات

○فکر و نظر
-اسلام کے اجتماعی اداروں کی تشکیل و تدوینِ نو کرنے کا ایک بہت اہم اور بڑا کام — مدیر — ۴
-پاکستان: خوفناک سیاسی و معاشی بحران کا حل — ۷
○تعلیم و تربیت
-انگلش میڈیم: غلامی کا جدید ذریعہ — اوریا مقبول جان — ۸
-واہ کینٹ کے ماڈل تعلیمی ادارے — محمد سلیم اختر — ۱۲
-گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمارا تعلیمی پروگرام — ادارہ — ۲۰
○تفہیم دین/مکالمہ
'نظام' کی تبدیلی اور 'خلافت' کی بحالی؟ — ڈاکٹر محمد امین — ۲۵
○فقہ و قانون
-ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے متعلق ایک اہم فقہی مسئلہ — ڈاکٹر حسن مدنی — ۳۴
-یورپین کورٹ برائے بنیادی حقوق کا فیصلہ شریعت سیکولرزم، جمہوریت اور بنیادی حقوق کی مخالف ہے — ترجمہ: مدیر — ۴۸
○اسلام اور پاکستان
پاکستان میں نفاذِ شریعت اور علماءِ سُوء — رانا شمس الرحمٰن — ۵۲
○اسلام اور مغرب
اسلام، مغربی تہذیب اور قومی ریاست ترجمان القرآن کے ایک مضمون کا تجزیہ — مدیر — ۵۴
○البرہان کی ڈاک/مکالمہ
البرہان کے نام — ادارہ — ۶۴
جدت اور جدیدیت - ترکی کے دینی مدارس اور امیج کلچر کی بحث

مدیر
ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر
محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0309-4607124)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے
سالانہ 1000 روپے - پانچ سال: 5000 روپے
تاحیات 40,000 روپے

تحریکِ اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

فکرونظر

اسلام کے اجتماعی اداروں کی تشکیل وتدوینِ نو

کرنے کا ایک بہت اہم اور بڑا کام

اہلِ علم اور اہلِ خیر توجہ فرمائیں

* انسانی اور اسلامی زندگی کے دو اہم پہلو ہیں: ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی۔ اسلام انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں کے لیے رہنمائی عطا فرماتا ہے۔ اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ نے انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل کر کے دکھایا اور اسلام کا مطلوبہ فرد، معاشرہ اور ریاست قائم کر کے دکھائی۔ مسلمان امت کی ذمہ داری یہ تھی اور ہے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرے۔ امہ کے زوال کے بعد مغربی استعمار نے مسلمانوں کے فرد کی تعمیر سیرت کے ذمہ دار اداروں (نظامِ تعلیم وتربیت، تزکیۂ نفس، دعوت واصلاح، میڈیا، ادب وثقافت) اور اجتماعی زندگی کو کنٹرول کرنے والے اداروں (سیاسی نظام، معاشی نظام، عدالتی نظام وغیرہ) کو منہدم کر دیا اور ان کی جگہ مغربی فکر وتہذیب کے مطابق نئے اداروں کو منظم کیا تاکہ مسلمان ہمیشہ ان کے فکری وعملی غلام رہیں اور اپنے دین اور نظام حیات سے دور رہیں۔ اس میں استعمار کو کامیابی ہوئی۔

* دوسری جنگِ عظیم کے بعد یورپی استعمار اپنے مقبوضہ جات پر قبضہ برقرار نہ رکھ سکا اور اسے مجبوراً مسلم ممالک کو آزادی دینا پڑی جہاں پہلے ہی مسلمان آزادی کی تحریکیں چلا رہے تھے۔ یوں مسلم ممالک آزاد ہو گئے لیکن استعمار نے کوشش اور سازش سے اقتدار ان قوتوں کو منتقل کیا اور ان کے اقتدار میں رہنے میں ان کی معاونت کی جو اس کے حاشیہ بردار تھے، جو اس کی فکر وتہذیب سے مرعوب ومتاثر تھے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے علم بردار تھے۔ چنانچہ ان مسلم حکمرانوں نے استعماری دور کے نظام تعلیم وتربیت اور اجتماعی اداروں کو قائم رکھا اور اسلامی تناظر میں ان کی تشکیلِ نو اور تدوینِ نو کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی۔

دینی قوتوں میں سے کچھ نے سیاسی میدان میں اسلامی مقاصد کے لیے کام کرنے کی خاطر مغرب کی الحادی جمہوریت کو معمولی اسلامی تبدیلیوں سے قبول کر لیا اور فرد کی تعمیر سیرت

کے کام پر کماحقہ توجہ نہ دی۔ کچھ دینی قوتیں ایسی مذہبی تعلیم وتبلیغ میں مصروف رہیں جس میں اجتماعی دینی مقاصد کے لیے کام کرنا ان کے پیش نظر ہی نہ تھا۔

* ان عوامل کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم معاشرے میں افراد کی تعمیر سیرت کا کام متوازن انداز میں نہیں ہو پایا۔ ہم پچھلی تین دہائیوں سے اہل ملک اور اہل دین کو توجہ دلا رہے ہیں کہ وہ نظام تعلیم وتربیت، دعوت واصلاح، تزکیۂ نفس، ادب اور میڈیا کی اصلاح کریں تاکہ افراد کی تعمیر سیرت کا کام صحیح خطوط پر ہو منظم سکے اور مسلم فرد اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مطلوبہ قرآنی کردار ادا کر سکے۔

* آج ہم اہل علم ودانش کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ اجتماعی اداروں کی تشکیلِ نو اور تدوینِ نو کا کام بھی نہیں ہوا اور اسے کوئی کر بھی نہیں رہا جیسے اسلام کا معاشی نظام، اسلام کا سیاسی نظام، اسلام کا عدالتی نظام.... وغیرہ سوائے اِکا دُکا انفرادی علمی کاوشوں کے۔ ہم ملک کے دینی اور سیاسی حلقوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس طرف توجہ فرمائیں اور اس کام کا ڈول ڈالیں۔ یہ کام کسی ایک فرد کے کرنے کا نہیں بلکہ یہ کام متعلقہ شعبوں کے ان ماہرین کے مل کر کرنے کا ہے جو اسلامی تناظر میں سوچتے ہیں اور مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کے شر سے بچنا چاہتے ہیں۔

* یہ کام کرنے کا اصولی طریقہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کو سامنے رکھا جائے، امت کے بارہ سو سالہ علمی وعملی تجربات سے استفادہ کیا جائے اور عصری ضرورتوں کو بھی مدنظر رکھا جائے اور اجتہادی سپرٹ سے کام لیتے ہوئے ہر شعبے کا تفصیلی نظام وضع کرنے کی کوشش کی جائے۔ ضروری ہے کہ اس کام میں مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کی نقالی سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

* یہ کام اتنا بڑا ہے کہ اصلاً حکومت اور حکومتی اداروں کے کرنے کا ہے جہاں افرادی اور مادی وسائل کی کمی نہیں ہوتی۔ تاہم ہمیں توقع نہیں کہ کوئی حکومتی ادارہ یہ کام کرے گا۔ اس لیے ہم دینی جماعتوں، تنظیموں اور اداروں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ یہ کام کرنے کا سوچیں۔

* دوسرے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہم خود بھی اپنی تمام تر

بے بضاعتی اور تنگ دامانی کے باوجود حسبِ حیثیت اور حسبِ صلاحیت اس سلسلے میں کچھ پیش رفت کرنا چاہتے ہیں بشرطیکہ کچھ وسائل میسر آ جائیں۔ اگر اہلِ علم اور اہلِ خیر ہم سے تعاون فرمائیں اور اللہ تعالیٰ کا فضل ہمارے شامل حال ہو تو ممکن ہے اس اہم دینی کام کے سلسلے میں ہم ملک وملت کی کچھ خدمت کر سکیں۔ وماتوفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

محمد امین

۲۴ رمئی ۲۰۲۳ء

ڈاکٹر محمد شریف نظامی [۱]

نفاذ اردو کے لیے ہمارے مطالبات

* اعلیٰ مرکزی وصوبائی ملازمتوں کے مقابلے کے تمام امتحانات ایک سال کے لیے اردو اور انگریزی میں لیے جائیں اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے اردو میں۔

* نجی اور سرکاری تمام تعلیمی اداروں میں ذریعۂ تعلیم میٹرک تک فوراً اردو ہو جبکہ ایک سال بعد یہ دائرہ انٹرمیڈیٹ تک بڑھا دیا جائے۔ واضح رہے کہ وفاقی اردو یونیورسٹی میں بی ایس کی سطح تک کا سائنسی و دیگر مضامین کا اردو میں نصاب موجود ہے، جسے ہم سپریم کورٹ کے جسٹس اعجاز الاحسن صاحب کو پیش کر چکے ہیں۔

* عدلیہ کی ہر سطح کی کاروائی اُردو میں ہو اور تمام فیصلے اردو میں تحریر اور جاری کیے جائیں۔

* مرکزی اور صوبائی سیکرٹریٹ اور ماتحت حکام کو فوری طور پر پابند کیا جائے کہ تمام کارِ سرکار اردو میں ہو۔

* جو متعلقہ سرکاری ودیگر حکام مندرجہ بالا کی پابندی نہ کریں انہیں آئین کی خلاف ورزی اور توہین عدالت کے تحت جیل بھیجا جائے کہ بنگلہ دیش میں یہی طریقہ کارگر ثابت ہو چکا ہے کیونکہ لاتوں کے بھوت شریفانہ باتوں سے راہِ راست پر نہیں آیا کرتے۔

---

[۱] بانی پاکستان قومی زبان تحریک، لاہور

فکرونظر

پاکستان کا خوفناک سیاسی ومعاشی بحران

اس کا ایک ہی حل ہے کہ عوام اٹھ کھڑے ہوں

ہم مسلمان ایسے ہی زوال پذیر نہیں ہوئے۔ جس قوم اور ملک کے لیڈر اپنے ذاتی مفاد کو قوم وملک کے مفاد پر ترجیح دیں، ٹوٹنا اور ڈوبنا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ پاکستان ۱۹۷۰ء میں اسی لیے ٹوٹا تھا کہ مغربی پاکستان کے سیاسی لیڈر (بھٹو) نے اپنے ذاتی اقتدار کے لیے فوجی حکمران (جنرل یحییٰ) کو تسلسلِ اقتدار کا لالچ دے کر ساتھ ملا لیا اور مشرقی پاکستان میں جیتی ہوئی پارٹی (عوامی لیگ) کو اقتدار منتقل نہ ہونے دیا۔

آج بھی وہی صورت حال ہے۔ ملک کنگال ہو چکا، لوگ بھوکے مر رہے ہیں لیکن ہمارے سیاسی اور فوجی حکمرانوں کو نہ سیاسی عدم استحکام کی پرواہ ہے نہ معاشی تباہی کی اور نہ آئین کی خلاف ورزی کی، صرف اپنا ذاتی وگروہی مفاد عزیز ہے اس لیے وہ ملک میں انتخابات نہیں ہونے دے رہے کیونکہ انہیں صاف نظر آرہا ہے کہ ملک میں مقبول جماعت (عمران خاں کی تحریک انصاف) جیت جائے گی۔ اس لیے وہ ہر قسم کی آمریت وفسطائیت سے کام لے رہے ہیں، جھوٹا پروپیگنڈا کر رہے ہیں، انہوں نے ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے اور عدلیہ کو بھی دبا رکھا ہے۔ طاقتور مغربی ممالک بھی ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں کہ وہ بھی ایک کمزور اور لاغر پاکستان ہی اپنے گماشتوں کے ہاتھوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

موجودہ بحرانی صورتِ حال سے نکلنے کا ہمیں ایک ہی حل نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ عوام موجوہ سیاسی اور فوجی گٹھ جوڑ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور سافٹ انقلاب برپا کر دیں کیونکہ جب عوام اٹھ کھڑے ہوں گے تو ان کا راستہ فوج بھی نہیں روک سکتی کیونکہ کوئی فوج بھی اپنے عوام پر گولیاں نہیں چلا سکتی اور تبدیلی آ کر رہتی ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عوام کے پاس عذر بہت ہیں۔ اس سے پہلے ایوب خان اور بھٹو کے خلاف عوامی تحریکیں اٹھی تھیں لیکن دونوں دفعہ عوام کو کچھ نہیں ملا۔ بھوک، غربت، جہالت بھی عوام کے اعذار ہیں لیکن ہمیں تدبیر کے لحاظ سے اس وقت اس کے علاوہ اور کوئی حل نظر نہیں آتا۔ اے اللہ! ہمارے حال پر رحم فرما۔

تعلیم و تربیت

اوریا مقبول جان

انگلش میڈیم - غلامی کا جدید ذریعہ

آج سے صرف ڈیڑھ سو سال قبل تک امریکہ اور یورپی استعماری قوتوں کو صحت منداور جفاکش مزدور درکار تھے۔ اس لئے جہاں ممکن ہوتا، اپنی کالونیوں یعنی زیرِ تسلّط ایشیائی اور افریقی ممالک سے فیکٹریوں میں کام کرنے، کھیتوں کو آباد کرنے اور کوئلے اور دیگر معدنیات کی کانوں میں تکلیف دہ مشقت کے لئے افراد کو اپنے ممالک میں بلایا جاتا اور ان کی محنت پر اپنی صنعتی اور زرعی ترقی کی عمارت استوار کی جاتی۔ امریکہ کی چونکہ کوئی ایسی کالونی نہیں تھی، مگر اسے بھی مس سپی جیسے دریاؤں کے ساتھ آباد کھیتوں میں کام کرنے کے لئے صحت مند افراد کی بہت ضرورت تھی، سو اس نے افریقہ سے سیاہ فام افراد کو پکڑ کر انہیں بدترین غلامی میں جکڑنے کے دھندے کو عروج بخشا۔ مختلف طریقوں سے افریقہ میں انسانوں کو اغواء، جنگ اور پھندے لگا کر جانوروں کے غول کی طرح پکڑا جاتا، پھر انہیں ایک ایسے قید خانے میں رکھا جاتا جس کے صحن کے ایک جانب مرد، دوسری جانب عورتیں اور تیسری جانب بچے قید کئے جاتے۔ مردوں کو صحن میں نکال کر بُری طرح پیٹا جاتا اور ان کی عورتیں اور بچے دیکھتے رہتے اور سوائے آنسو بہانے کے ان کو کسی چیز کا یارا نہ ہوتا۔ عورتوں کو باہر نکال کر ان پر جنسی تشدد کیا جاتا اور سامنے والے پنجرے میں کھڑے ان کے باپ، بھائی اور خاوند تلملاتے رہتے۔ اسی طرح بچے بھوک سے بلبلاتے، روتے، تڑپتے، لیکن والدین ان کی کسی بھی قسم کی مدد کو نہ آسکتے۔

یوں کئی سال ان کو ایسے قید خانوں میں رکھ کر جب یہ یقین کر لیا جاتا کہ ان میں آزاد ہونے کی اب کوئی اُمید باقی نہیں رہی اور یہ اپنی غلامی پر سمجھوتہ کر چکے ہیں تو انہیں امریکہ لے جانے کے لئے بحری جہازوں پر سوار کیا جاتا۔ جس کیبن میں انہیں ٹھونس کر بھرا جاتا اس کی چھت زیادہ سے زیادہ تین فٹ بلند ہوتی۔ کئی ماہ کے سفر کے دوران، سو میں سے نوّے غلام راستے میں ہی دَم توڑ جاتے، جنہیں سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا جاتا اور باقی دس فیصد جو سختیاں جھیل کر سخت جان ہو چکے ہوتے، انہیں سفید فام امریکیوں کے حوالے کیا جاتا۔

بازاروں میں منڈیاں لگتیں، اشتہار بٹتے اور گورے زمیندار انہیں خرید کر لے جاتے۔ تاریخی شواہد کے مطابق پہلا افریقی غلاموں کا جہاز 1502ء میں اس دَور کی ریاست ہسپانیولا (Hispaniola) جو آج کل ہیٹی اور ڈومینیکن ریپبلک کے دو ممالک میں تقسیم ہے وہاں لنگر انداز ہوا۔ اس کے بعد 1518ء میں جمیکا میں چار ہزار غلاموں کا قافلہ لایا گیا۔ سپین نے جب موجودہ امریکی ریاست جنوبی کیرولینا کو اپنے تسلّط میں لیا تو وہ اپنے ساتھ غلاموں کو بھی لے گئے۔ ان غلاموں نے وہاں پر آباد ریڈ انڈین کے ساتھ مل کر سپین والوں کے خلاف بغاوت کر دی مگر بعد میں یہ بدنصیب امریکی گوروں کے قبضے میں آ گئے۔ صنعتی ترقی، مشینوں کی آمد اور عوامی بیداری کی تحریکوں کے نتیجے میں غلاموں کی تجارت پر سب سے پہلے برطانیہ نے 1807ء میں پابندی لگائی۔ امریکہ میں ان کے خلاف ابراہم لنکن کی صدارت میں باقاعدہ شمالی اور جنوبی ریاستوں کے درمیان جنگ ہوئی جس میں غلامی کے خاتمے والی ریاستیں جیت گئیں۔ غلاموں کا آخری جہاز جس کا نام کلوٹلڈا (Clotilda) تھا، وہ 1859ء میں الباما کے شہر موبل (Mobil) کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ لیکن ان تین صدیوں میں غلاموں کی تجارت سے اس قدر افریقی غلام امریکی اور یورپی ریاستوں میں آ چکے تھے کہ ان ملکوں کے کھیت آباد اور کارخانے چلتے رہے۔ اس کے بعد پوری ایک صدی برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور پرتگال جیسی طاقتوں کی افریقہ اور ایشیا کے ممالک پر تسلّط کی صدی ہے، جہاں سے انہیں افرادی قوت بخوبی مل جاتی تھی۔ لیکن اب یہ لوگ نسبتاً آزاد تھے، مگر معاشرے میں ان کا مقام اور مرتبہ ثانوی بلکہ محکوم (Subjects) والا تھا۔

جنگِ عظیم دوم کے بعد دنیا کے نقشے پر تین اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں:

ا۔ بڑی طاقتوں نے اپنی زیرِ تسلّط کالونیوں کو آزاد کرنا شروع کیا لیکن اس کے بدلے میں امریکہ نے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے ذریعے انہیں غلام بنا لیا۔

۲۔ سوویت یونین کے ساتھ سرد جنگ کا آغاز ہوا اور مزدوروں کے انقلاب کے خوف سے یورپ میں مزدوروں کو مراعات ملنے لگیں۔

۳۔ پاپولیشن کنٹرول کے لیے پہلے مانع حمل کنڈوم مارکیٹ میں آئے، پھر اس کے بعد

جیسے ہی خواتین کے لئے مانع حمل گولی 1960ء میں ایجاد ہوئی تو اس نے اخلاقیات، معاشیات اور خاندانی زندگی کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ کنڈوم کا استعمال باہم رضامندی پر منحصر تھا لیکن ''گولی'' نے اس کا اختیار عورت کو دے دیا جو اسے خفیہ طور پر بھی استعمال کرسکتی تھی۔ اس کے بعد اخلاقیات کا جو بیڑا غرق ہونا تھا وہ تو ہوا لیکن اس کے نتیجے میں آبادی میں اس قدر کمی واقع ہوگئی کہ صرف تیس سال بعد ہی یورپ کے اٹھارہ ممالک آبادی کی شدید کمی کا ایسا شکار ہوئے کہ انہیں اپنی شہری سہولیات چلانے کے لئے لوگوں کو باہر سے منگوانا پڑ گیا۔ مگر اب نظامِ کار انتہائی جدید ہو چکا تھا۔ اس لئے اب جاہل، اَن پڑھ اور جسمانی طور پر مضبوط لوگ نہیں چاہئے تھے، بلکہ پڑھے لکھے اور مہارتوں میں طاق (Professionals) کی ضرورت تھی۔ یہ صرف اسی صورت ممکن تھا اگر غریب ممالک کو ان کی اپنی زبانوں میں تعلیم کی بجائے انگریزی میں تعلیم دلوانے پر مجبور کیا جائے اور نصابِ تعلیم بھی ایسا مہیا کیا جائے جو صرف اور صرف مغربی معاشرے کے گیت گاتا ہو اور مغرب کو glorify کرتا یعنی اس کی توصیف وتعریف کرتا ہو۔ بھارت، سری لنکا، ملائیشیا، انڈونیشیا، فلپائن اور سنگاپور جیسے ممالک نے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا جس کے پیچھے چھپی خواہش یہ تھی کہ ہمارے نوجوانوں کو یورپ اور امریکہ کی سرزمین پر آسانی سے ملازمت مل جائے۔ یوں ان غریب ملکوں سے ذہین اور قابل لوگوں کا انخلاء شروع ہوا اور ان کی محنت سے امریکہ اور یورپ ترقی کی منازل طے کرنے لگا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان ''جدید پڑھے لکھے غلاموں'' کو پڑھانے لکھانے کا سارا خرچہ بھی غریب ممالک کے والدین کرتے ہیں مگر ان کی صلاحیتوں سے فائدہ یورپی ممالک اٹھاتے ہیں۔ یعنی غریب لوگ اپنے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرکے ''جدید غلاموں'' کی منڈی میں کھڑا کرتے ہیں اور جب ان کی اچھی بولی لگ جاتی ہے تو یہ والدین خوش ہوجاتے ہیں۔

پاکستان میں اس ''وباء'' کا آغاز اسّی کی دہائی میں ہوا جب شہر شہر انگلش میڈیم سکول کھلنے لگے۔ یوں پاکستان کا دامن بھی قابل اور اہل لوگوں سے خالی ہونے لگا۔ برٹش کونسل کی رپورٹ کے مطابق 2023ء میں ایک لاکھ سے زیادہ نوجوان ''اولیول'' کا امتحان دیں گے۔ اس کے آٹھ مضامین کی فیس دو لاکھ گیارہ ہزار روپے ہے۔ یعنی ایک ''اولیول'' امتحان پر 21

ارب روپے خرچ ہوں گے جو تقریباً سات کروڑ پچاس لاکھ ڈالر بنتے ہیں۔ ان کے علاوہ "A" لیول، IGCSE اور GCSE وغیرہ کے امتحانات علیحدہ ہیں۔ یہ ایک لاکھ طلبہ وہ ہیں جنہوں نے سکولوں میں دس سال ایسی کتب پڑھی ہیں جن میں مغرب کا ماحول نمایاں ہے، وہاں کی اخلاقیات، وہاں کی معاشرت کی باتیں اور کہانیاں موجود ہیں۔ اسی لئے ان بچوں کے ذہنوں میں ان کی منزلِ مقصود یورپ اور امریکہ میں ڈاکٹر، انجینئر یا کسی دوسرے شعبے میں نوکری کا حصول ہے۔ والدین ان کی مغرب میں مزید تعلیم پر بھی اربوں ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ یہ تمام نوجوان جب اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ یا امریکہ جاتے ہیں تو انہیں یوں لگتا ہے، جیسے وہ نصاب کی کتابوں میں دکھائی گئی خوابوں کی سرزمین میں آگئے ہیں۔ یہ ایک لاکھ تو اشرافیہ کے بچے ہیں جو ملک چھوڑ گئے، لیکن اس کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ نقالی میں گلی گلی اور شہر شہر میں دوسرے درجے کے انگلش میڈیم سکول کھل گئے جن میں آج کروڑوں بچے اپنے ماحول سے برگشتہ اور اپنی ثقافت سے دُور کسی دوسرے کی زبان میں علم حاصل کر رہے ہوتے ہیں، ان نقال نوجوانوں کو یورپ اور امریکہ میں ملازمت تو ملتی نہیں مگر وہ اپنے ماحول کے لئے بھی اجنبی بن چکے ہوتے ہیں۔ یہ نوجوان ایسے ''جدید غلام'' ہیں جو منڈی میں آس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں لیکن ان کی کوئی قیمت نہیں لگاتا۔

مہتمم حضرات کو مشورہ

مہتمم حضرات ایسے مدرسین کو پسند کرتے ہیں جو اُن کی خوشامد کریں، گو تعلیمی استعداد کے لحاظ سے کورے ہی ہوں۔ یہ لوگ اہل فضل وکمال کو نہیں چاہتے، کامل کو خوشامدی بننے کی کیا حاجت ہے؟ کامل تو پورے استغناء سے رہے گا۔ مہتمم کو اس کے ناز برداشت کرنے ہوں گے، اگر کام مقصود ہوگا۔ جو گائے دودھ دیتی ہے وہ لات مارتی ہے۔ اگر خدمت دین اور معیاری چاہتے ہوں تو مہتمم حضرات اپنا مزاج بدلیں۔

(مولانا محمد یوسف بنوریؒ)

تعلیم و تربیت

محمد سلیم اختر[1]

واہ کینٹ کے ماڈل تعلیمی ادارے

مدیر البرہان ڈاکٹر محمد امین صاحب چونکہ تعلیم اور اس کی اسلامی تشکیل نو کے معاملے میں دلچسپی لیتے ہیں، اس لیے پچھلے تقریباً پندرہ برس سے، جب سے ان سے تعارف ہوا، وہ ہمارے اداروں کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ایک دفعہ وہ ہمارے ہاں تشریف بھی لائے اور اساتذہ سے خطاب کیا۔پچھلے ماہ انہوں نے مجھے کہا کہ میں اپنے اداروں کا تعارف قارئین البرہان سے کراؤں تا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو تھوڑا بہت کام کرنے کی توفیق دی ہے، اسے دیکھ کر دوسروں کو بھی ترغیب ہو۔ چنانچہ ہمارے قائم کردہ چار قسم کے اداروں کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے۔

۱۔ الجامعۃ الاسلامیہ: خواتین کا اقامتی دینی مدرسہ مع عصری تعلیم

۲۔ پائینئر اسلامک سکولز: طلبہ وطالبات کے لیے لالہ زار میں ہائی سکول اور اس کی دو برانچیں خیبر ٹاؤن اور گڑھی افغان میں

۳۔ ذکری ایجوکیشن سسٹم: عصری تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کے لیے تجوید و ترجمہ قرآن کے مکاتب

۴۔ مدرسہ ماڈل سکولز: دینی مدارس کے طلبہ کے لیے ان کے مدارس کے اندر عصری تعلیم کا انتظام

اور اب ان اداروں کی کچھ تفصیل؛ لیکن ہم ابتداء کرتے ہیں ان بنیادی اصولوں کے ذکر سے جو ہم نے شروع ہی میں طے کیے تھے۔

بنیادی اصول

راقم مسلمانوں کو دین سے جوڑنے اور عوام میں دینی بیداری پیدا کرنے کے لیے عرصہ دراز سے درس قرآن وغیرہ کا سلسلہ واہ کینٹ میں جاری رکھے ہوئے تھا۔ ۲۰۰۲ء میں خیال آیا کہ باقاعدہ تعلیمی ادارے قائم کرنے چاہئیں۔اس کے لیے تین بنیادی اصول سامنے رکھنے کا فیصلہ کیا:

---

[1] مدیر الجامعۃ الاسلامیہ، پائینئر اسلامک پبلک سکولز، ذکری ایجوکیشن سسٹم و مدارس ماڈل سکولز واہ کینٹ

۱۔ تعلیم اسلامی تناظر میں دینا کہ تمام علوم قرآن مجید کی ماتحتی میں رہیں۔

۲۔ تعلیم ثنویت کا خاتمہ یعنی عصری تعلیم اسلامی تناظر میں اور دینی تعلیم عصری تناظر میں دینا۔

۳۔ تعلیم کو کاروبار نہ بنانا بلکہ اخلاص سے اشاعت دین کو ہدف بنانا اور بنائے رکھنا۔ لیکن کوئی بھی کام مال کے بغیر قرار نہیں پکڑتا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی مال کو 'قوام'، یعنی کھڑا رکھنے والا قرار دیا ہے لہٰذا قرآن مجید کے اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے انفاق فی سبیل اللہ کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ نیز ادارہ جہاں مناسب سمجھتا ہے، وہاں مشورے سے بچوں پر کوئی فیس بھی عائد کر سکتا ہے۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں ان اصولوں پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائی۔

الجامعۃ الاسلامیہ

پہلا ادارہ جو راقم نے ۲۰۰۳ء میں اپنے استاد محترم سید ولی اللہ شاہ مرحوم کی سرپرستی میں قائم کیا، وہ لالہ زار میں خواتین کا دینی مدرسہ تھا جسے عصری تناظر میں چلانا ہمارے پیش نظر تھا۔

اس جامعہ میں اس وقت درج ذیل کلاسز جاری ہیں:

۱۔ مستقل روایتی درس نظامی
۲۔ مختصر دورانیہ کے کورسز
۳۔ مختصر فنی کورسز
۴۔ غیر روایتی کلاسز

روایتی درس نظامی

جامعہ میں طالبات کو میٹرک کے بعد درس نظامی کروایا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایف تا ایم اے امتحانات دلوائے جاتے ہیں۔ درس نظامی کے ساتھ عصری تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بچیوں کی استعداد زیادہ ہو نیز وسعت نظری کے ساتھ ساتھ موجودہ نظریات وعلوم سے روشناس رہیں اور موجودہ اصطلاحات کو بخوبی سمجھنے کی صلاحیت حاصل ہو جائے۔

درس نظامی کا امتحان وفاق المدارس العربیہ سے دلوایا جاتا ہے جبکہ ایف اے کا فیڈرل بورڈ سے اور بی اے، ایم اے کا پنجاب یونیورسٹی لاہور سے۔

وفاق المدارس کے سالانہ امتحانات کے بعد طالبات کو تعطیلات نہیں دی جاتیں اور شعبان ورمضان میں مختصر دورانیہ کے کورسز کروائے جاتے ہیں۔ جیسے ۴۰ روزہ دورۂ ترجمۂ قرآن، ۲۵ روزہ دورۂ صرف ونحو، ۲۰ روزہ تربیتی پروگرام، ۲۵ روزہ عربی بول چال پروگرام،

• ۳۰روزہ احسن العلم پروگرام۔

مختصر فنی کورسز

طالبات کے لیے ایک ماہ سے لے کر چھ ماہ کے مختصر دورانیے کے کورسز کروائے جاتے ہیں جیسے ٹیچرز ٹریننگ کورس، کمپیوٹر کورسز، سلائی کورس، ناظرہ وترجمۂ قرآن اور حدیث وفقہ پڑھانے کی تربیت۔

طالبات کو درس نظامی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ترجمہ قرآن پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ نیز عربی بول چال اور ان کی شخصیت سازی کے لیے فن خطابت پر زور دیا جاتا ہے۔طالبات کی تربیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ایک عورت کی تعلیم وتربیت نسل کی تعلیم وتربیت ہے۔ طالبات کے لیے ہاسٹل کی سہولت موجود ہے جس میں کم وبیش ۴۰ طالبات رہائش پذیر ہیں۔

غیرروایتی کلاسز

ترجمۂ قرآن، حدیث اور فقہ کی شام کے اوقات میں مختلف مقامات پر کلاسز ترتیب دی جاتی ہیں جن میں غیر روایتی طریقے سے مختلف عمر کے افراد کے لیے مختلف دورانیے کی کلاسز سال بھر جاری رہتی ہیں۔ ان کلاسز سے معاشرے کے وہ افراد مستفید ہوتے ہیں جو اپنی مصروفیات کی وجہ سے روایتی طریقہ سے تعلیم حاصل نہیں کرسکتے۔

پائینئر اسلامک پبلک سکول

ہمارا ماٹو ہے: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ یعنی دنیا وآخرت دونوں کی بھلائی۔ اور ہمارے پیش نظر ایسا نظام تعلیم متعارف کروانا ہے جو نہ صرف جدید اور سائنسی علوم کی معیاری تعلیم مہیا کرے بلکہ نئی نسل کو آخرت میں کامیابی کے لیے تیار بھی کرے۔اس مقصد کے لیے ہم اپنے طلبہ وطالبات کو ایک ایسا بھرپور ماحول مہیا کرتے ہیں جو تعلیم کے ساتھ حقیقی اسلامی اقدار کے مطابق تربیت بھی کرتا ہے۔منتخب نصاب تعلیم میں معاشرتی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے، دینی تعلیمات اور سائنسی علوم کی بہترین تعلیم دی جاتی ہے۔قرآن اور حدیث کی بنیادی تعلیم نصاب

کا اہم ترین جزو ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، ماہر اور تجربہ کار اساتذہ بچوں کو بہترین تعلیم دینے کے لیے بھرپور محنت کرتے ہیں۔

حکومت کے مروجہ نصاب کے مطابق آفاق پبلشرز کی کتب کلاس اول تا ہفتم بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں۔ کلاس ہشتم میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتب اور کلاس نہم دہم میں فیڈرل بورڈ آف انٹرمیڈیٹ کے نصاب کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ تاہم اگر اس میں کوئی خلاف شرع بات ہو تو اس کو حذف کر دیا جاتا ہے۔

نرسری تا چہارم: ناظرہ قرآن کی مکمل تعلیم

پلے گروپ، نرسری اور پریپ تین سال میں مکمل نورانی قاعدہ پڑھایا جاتا ہے جبکہ کلاس اول میں جوڑ کے ساتھ ایک پارہ، کلاس دوم میں چار پارے، سوم میں دس پارے اور چہارم میں پندرہ پارے پڑھا کر ناظرہ قرآن مجید کی تعلیم کی تکمیل کی جاتی ہے۔ ناظرہ قرآن مجید باقاعدہ ایک مضمون کے طور پر شامل نصاب ہے۔ باقی مضامین کی طرح اس کے گرینڈ ٹیسٹ اور امتحانات ہوتے ہیں اور یہ مضمون ایک لازمی مضمون کے طور پر شامل نصاب ہے یعنی اس میں فیل بچہ کو مکمل فیل سمجھا جاتا ہے۔

پنجم تا ایف اے: القرآن والحدیث والفقہ

قرآن مجید کے ترجمہ کو بطور ایک لازمی مضمون کے نصاب تعلیم میں اس ہدف کو سامنے رکھتے ہوئے شامل کیا گیا ہے کہ بچے میٹرک تک اس قابل ہو جائیں کہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے وہ سمجھ رہے ہوں کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں یا امام کی تلاوت سنتے ہوئے بھی اسے سمجھ رہے ہوں۔ جماعت پنجم میں سورہ یونس اور سورہ ھود سے ترجمہ قرآن کے نصاب کی ابتدا کی گئی ہے، جو کہ نسبتاً لفظی ترجمہ کے اعتبار سے آسان سورتیں ہیں نیز ان میں بلوغت وغیرہ کے مسائل در پیش نہیں آتے۔ وہ سورتیں جن میں بلوغت کے بعد کے مسائل مثلاً نکاح، طلاق وغیرہ کا ذکر ہے وہ میٹرک کے بعد یعنی ایف اے میں رکھی گئی ہیں۔ پھر ششم تا دہم آسان سے مشکل کی جانب سفر جاری رہتا ہے حتیٰ کہ میٹرک تک قریباً سولہ پارے ترجمہ کے ساتھ طلبا و طالبات پڑھ لیتے ہیں۔ یہ نصاب قریباً پندرہ سال سے پڑھایا جا رہا ہے۔

تمام کلاسز میں حدیث وفقہ کا نصاب

الحدیث کے عنوان کے تحت

بچوں کو اسوۂ حسنہ سے روشناس کرواتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں بچوں کی تربیت کے لیے یہ مضمون بھی ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل نصاب ہے تاکہ بچوں کو صحیح اسلامی قالب میں ڈھالا جاسکے۔

الفقہ کے عنوان کے تحت

بچوں کو آداب زندگی (مثلاً کھانے پینے کے آداب، سلام کرنا، دعائیں وغیرہ)اور عمر کے اعتبار سے ان ضروری مسائل کا علم اور عمل دیا جاسکے جن کو جاننا ان کے لیے نہایت ضروری ہے مثلاً نماز پڑھنے کی عمر پر وضو اور نماز سکھانا، ساتھ ساتھ نماز کے مسائل، پھر روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے مسائل، پھر میٹرک میں بنیادی اسلامی معاشیات کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔

پنجم تا ایف اے۔عربی زبان کی تعلیم

عربی زبان کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے تاکہ قرآن وحدیث کو سمجھنے میں آسانی ہو نیز ایک بین الاقوامی زبان سیکھنے کے لیے بنیاد بن سکے۔اس مقصد کے لیے اقراء کے نام سے مولانا محمد بشیر صاحب سیالکوٹی کی کتب منتخب کی گئی ہیں جو جماعت پنجم تا ہفتم پڑھائی جاتی ہیں نیز ہشتم میں پنجاب بورڈ کی عربی پڑھائی جاتی ہے۔

حفظ القرآن کلاسز (اختیاری) سوم تا ہفتم

جماعت سوم میں بچوں کو پری حفظ کلاس میں داخلہ دیا جاتا ہے جس میں ان کا ناظرہ اور تلفظ وادائیگی وغیرہ درست کی جاتی ہے۔ نیز حفظ کے ساتھ قرآن حکیم، ریاضی اور انگریزی کے مضامین اپنی کلاس میں جا کر اٹینڈ کرنا ہوتے ہیں جبکہ باقی اوقات میں وہ حفظ کلاس میں بیٹھ کر اپنا سبق، سبقی 1، سبقی 2 اور منزل اپنے قاری صاحب کو سناتا ہے۔حفظ کلاس کے اوقات سکول کے اوقات سے آدھا گھنٹہ زیادہ رکھے جاتے ہیں۔تاہم اگلہ سبق بچہ شام کے وقت میں

اپنے گھر میں یاد کر کے اگلے دن سکول میں سناتا ہے۔

جماعت چہارم تا ششم بچے نے حفظ مکمل کرنا ہوتا ہے۔ عموماً بچے پنجم میں یا ششم میں اپنا حفظ مکمل کر لیتے ہیں تاہم حفظ مکمل کرنے کے بعد ایک سال کا دور یعنی دہرائی مکمل کرنے پر ہی اس بچہ کو مکمل حافظ سمجھا جاتا ہے اور حفظ کی سند دی جاتی ہے۔ نیز اس کا وفاق المدارس سے حفظ کا امتحان بھی دلوایا جاتا ہے۔

حفظ القرآن کے دور میں بچہ کو پہلے چھ ماہ میں ربع پارہ کا دور، پھر تین ماہ میں نصف پارہ کا دور اور پھر دو ماہ میں ایک ایک پارہ کا دور کروایا جاتا ہے۔ ابھی تک اس ادارہ سے قریباً 200 طلبہ وطالبات حفظ مکمل کر چکے ہیں۔ طلبا کو ہر سال رمضان سے پہلا ادارہ میں مدعو کر کے رمضان میں تراویح میں سنانے کے حوالہ سے مکمل بریفنگ دی جاتی ہے۔ اور جن بچوں کو سنانے کے لیے جگہ میسر نہ ہو اس کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔

تربیتی امور

تربیت تعلیم سے زیادہ اہم ہے لہٰذا اساتذہ اور طلبہ کے لیے اس کا مسلسل اہتمام کیا جاتا ہے۔

تربیت اساتذہ

اساتذہ کسی بھی تعلیمی ادارے کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ اساتذہ کے تعین کے وقت ان کی تعلیمی قابلیت، مہارت اور تجربہ کے علاوہ اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ نظریاتی اعتبار سے ادارہ کے مشن و مقاصد سے متفق ہوں اور ادارے کے ماحول سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

روزانہ میٹنگ: اساتذہ کے ساتھ روزانہ چھٹی سے پہلے ایک میٹنگ ہوتی ہے جس میں روزانہ اپنی باری کی ترتیب سے ایک ٹیچر ایک دو آیات کا لفظی ترجمہ کرتی ہے اور اس آیت میں آنے والے موضوعات پر ہلکی پھلکی بات چیت ہوتی ہے۔ پھر اس دن پیش آنے والے مسائل یا معاملات کے حوالے سے بات کی جاتی ہے۔ شکایات کا ازالہ، اساتذہ کو تربیتی امور کے حوالے سے نصیحت اور یاددہانی کروائی جاتی ہے۔ اور اہم امور طے کیے جاتے ہیں۔

ماہانہ لیکچرز: اساتذہ کے لیے ماہانہ بنیادوں پر لیکچرز کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں مختلف

شخصیات کو مدعو کیا جاتا ہے جو اساتذہ کی تربیت کے حوالے سے مختلف عنوانات پر بات چیت کرتے ہیں۔

تربیت طلبہ وطالبات

طلبہ کی تربیت وتعمیر شخصیت کے لیے القرآن والحدیث والفقہ کا مضمون رکھا گیا ہے۔

۱۔القرآن والحدیث والفقہ

یہ مضمون پڑھاتے ہوئے خواتین یا مرد استاد بچوں کے ذہنوں میں اس کے عملی پہلو کو خوب اجاگر کرتا ہے، نیز قال اللہ تعالیٰ اور قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دہرانے سے بچوں میں قرآن اور حدیث سے دلیل حاصل کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔خصوصاً فقہ کے عنوان کے تحت بچوں کو روزمرہ مختلف مواقع پر پڑھی جانے والی دعائیں یاد کرائی جاتی ہیں اور بچوں کے عمل میں لائی جاتی ہیں۔پھر مختلف آداب زندگی سکھائے جاتے ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ وہ بچوں کے عمل میں آجائیں۔

۲۔بچوں کی اسمبلی

اسمبلی میں بچوں کو تلاوت،نعت، اسمائے حسنہ،قومی ترانہ،ملی ترانہ اور دعا پڑھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ اساتذہ وعظ ونصیحت اور تربیتی امور کے لیے طے شدہ عنوانات پر بات چیت کرتے ہیں۔جمعہ کے دن اسمبلی میں سورۃ الکہف کی تلاوت کی جاتی ہے۔

۳۔نماز

نماز کی تعلیم وتربیت کے لیے حدیث وفقہ کے مضمون میں وضو اور نماز سکھائی جاتی ہے اور اس کی عملی تربیت دی جاتی ہے۔اور سکول میں روزانہ ظہر باجماعت نماز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

۴۔ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیاں

نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور اس کے لیے بھرپور مواقع فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس حوالے سے مقابلہ خوشخطی، مقابلہ تقاریر، مقابلہ قرأت ونعت، کھیلوں کے مقابلے وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔نیز

تربیتی پروگرام رکھے جاتے ہیں تاکہ بچوں کی بنیادی تربیت احسن انداز سے ہو سکے۔مثلاً ترغیب الصلوٰۃ،فرضیت الصلوٰۃ،طہارت آگاہی پروگرام وغیرہ۔

سائنس میں دلچسپی پیدا کرنے اور عملی سائنس کا ذوق وشوق پیدا کرنے کے لیے ایک سالانہ سائنسی نمائش رکھی جاتی ہے جس میں بچے بھرپور حصہ لیتے ہیں اور سائنسی ماڈلز بنا کر پیش کرتے ہیں۔کوشش کی جاتی ہے کہ سائنسدانوں اور پروفیسر کو اس نمائش میں مدعو کیا جائے تاکہ وہ بچوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ مزید رہنمائی بھی کر سکیں۔

۵۔باپردہ ماحول

بچوں کی تربیت تعلیم کے ساتھ ساتھ موثر انداز میں اسی وقت ہو سکتی ہے جب اساتذہ اور انتظامیہ ایک ایسا بہترین ماحول مہیا کریں جو عمل پر ابھارے، چنانچہ تمام خواتین اساتذہ سکول میں عبایہ اور نقاب میں رہتی ہیں۔بچیاں ایک باپردہ ماحول میں تعلیم حاصل کرتی ہیں اور مشاہدہ ہے کہ جماعت ہفتم وہشتم میں بچیاں اپنی خواتین اساتذہ سے متاثر ہو کر خود سے نقاب کرنا شروع کر دیتی ہیں۔

الغرض:ادارہ کی کوشش میں ہے کہ یہاں سے تعلیم مکمل کرنے والا بچہ/بچی وہ بنیادی دینی وعصری علوم حاصل کر لے کہ وہ عملی زندگی میں چاہے ڈاکٹر بنے، انجینئر بنے، استاد یا تاجر بنے یا زندگی کے اور کسی بھی شعبے میں چلا جائے لیکن وہ ایک اچھا مسلمان ہو اور معاشرے میں اپنا مثبت کردار ادا کرے اور دنیا اور آخرت کی فلاح وکامرانی پائے۔

امتحانی نظام

ادارہ میں تعلیمی سال کو دو ٹرم میں تقسیم کیا گیا ہے،اور ہر ٹرم میں گرینڈ ٹیسٹ کا نظام رکھا گیا ہے۔تمام امتحانات اور گرینڈ ٹیسٹ ایک مرکزی کمیٹی کے ذمہ ہیں جو پڑھانے والے اساتذہ کے علاوہ کچھ ماہرین پر مشتمل ہے۔سکول کی مختلف شاخوں میں ایک ہی سالانہ تعلیمی کیلنڈر کے تحت امتحانات وگرینڈ ٹیسٹ ہوتے ہیں اور تمام برانچز میں مرکزی کمیٹی کا بنایا گیا ایک ہی پیپر یا ٹیسٹ بھیجا جاتا ہے۔ہر مضمون کا استاد خود پیپرز چیک کرتا ہے،تاہم مرکزی کمیٹی پیپرز کو ری چیک بھی کرتی ہے۔(جاری ہے)

تعلیم و تربیت ادارہ

گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمارا تعلیمی پروگرام
فیزیکل و آن لائن

اس سال گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم نے بعض شارٹ کورسز شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

کورس نمبر 1

تدریس حافظ محمد عمران طحاوی (پی ایچ ڈی سکالر)

قرآنی عربی کورس

اس کورس کا مقصد طلبہ کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ قرآن مجید خود سمجھ سکیں۔

کورس تین اجزاء پر مشتمل ہے: ا۔لفظی ترجمہ پہلا پارہ ۲۔عربی گرامر ۳۔عربی تکلم

موضوعات

- قرآن کا تعارف اور اس کی زبان
- حروف اور ان کی اقسام
- معرفہ اور نکرہ، تذکیر و تانیث
- ضمائر اور ان کی اقسام
- اسم صفت
- مصادر کی تخریج
- فعل اور اس کی اقسام اور ان کی بناوٹ
- فعل ماضی اور مضارع
- جدید عربی اسماء و افعال

کورس نمبر 2

اسلام اور عصری مسائل۔تدریس پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

اسلام اور مغربی فکر و تہذیب

موضوعات

۱۔ مغربی فکروتہذیب کے بارے میں ہمارا ردّعمل کیا ہونا چاہیے؟ قبولیت ۔ردّ۔محدود استفادہ

۲۔ ردّ کرنے کے دلائل

i۔ مغربی تہذیب کی آئیڈیالوجی (عقائد) غیر اسلامی ہے۔

ہیومنزم، سیکولرازم، لبرل ازم، کیپٹل ازم اور ایمپیر یسزم

ii۔ قرآن وسنت کی تعلیمات

iii۔ مغربی قوموں کی اسلام ومسلم دشمنی

iv۔ اہل مغرب اہل کتاب ہیں۔

v۔ یہ تہذیب مسلمانوں کو دین سے دور کررہی ہے

vi۔ یہ ان کے زوال سے نکلنے میں مانع ہے

vii۔ یہ مسلمانوں کو مغربی تہذیب کی پیروی سکھارہی ہے۔

viii۔ یہ مسلمانوں کو سیاسی، معاشی، اخلاقی لحاظ سے کمزور کررہی ہے۔

۳۔ قبول کرنے کے دلائل

i۔ مغرب دنیاوی ترقی کا بہترین ماڈل ہے۔

ii۔ مغرب کی خوبیاں اسلامی تعلیمات کا نتیجہ ہیں۔

۴۔ محدود استفادے کا منہج ان کی اچھی چیزیں لے لو اور بری چھوڑ دو

کورس نمبر 3

اسلام اور عصری مسائل ۔تدریس پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

اسلام اور ہمارے سیاسی مسائل

موضوعات

۱۔ اسلام کی سیاسی تعلیمات

۲۔ سیاست کی دینی اہمیت میں مبالغہ
(اقامت دین/غلبۂ دین)

۳۔ خلافت اور خلافت وملوکیت

۴۔ خروج کی شرعی حیثیت

۵۔ شہادت حسینؓ وعبداللہ بن زبیرؓ

۶۔ خلافت، ۱۲ سو سالہ تجربات

۷۔ تنسیخ خلافت (اسباب ونتائج)

۸۔ اسلام اور مغرب کا سیاسی نظام

i۔ نیشنلزم/وطن پرستی

ii۔ قومی ریاست

iii۔ جمہوریت (انتخابات، آئین اور قانون سازی)

iv۔ تقسیم اختیارات

۹۔ اسلامی جمہوریت

۱۰۔ عصر حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیلِ نو

۱۱۔ اس پر عمل/بحالیٔ خلافت

۱۲۔ پاکستان میں عدم نفاذ شریعت (اسباب ونتائج)

۱۳۔ صحیح راہ عمل

کورس نمبر 4

اسلام اور عصری مسائل۔تدریس پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

اسلام اور ہمارے تعلیمی مسائل

موضوعات

۱۔ اسلام میں تعلیم و تربیت کی اہمیت

۲۔ ثنویت قابل رد ہے کیونکہ یہ خلافِ دین ہے اور امت کی بادہ سوسالہ تعلیمی روایت کے خلاف ہے۔

۳۔ مسلم ہندوستان میں مسلم نظام تعلیم کا خاتمہ اور لارڈ میکالے کے نظام کا اجراء۔

۴۔ مسلم ردّعمل بصورت دیوبند (اس منہج کی خوبیاں اور کمزوریاں)

مسلم ردّعمل بصورت علی گڑھ (اس کی خوبیاں اور کمزوریاں)

۵۔ دیوبند اور علی گڑھ کا ردّعمل: ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ اور خاتمہ ثنویت میں ان کی ناکامی۔

۶۔ پاکستان میں دینی مدارس کا تسلسل اور اس کے نقصانات

i۔ غیر اسلامی ثنویت کا استحکام ii۔مسٹر اور ملّا کی تقسیم iii۔ریاست کی اسلامائزیشن میں ناکامی

vi۔فرقہ واریت کا فروغ

۷۔ جدید نظام تعلیم اور اس کے نقصانات

i۔مغرب پرستی ii۔فکری و عملی غلامی iii۔فکری کشمکش اور بے کرداری vi۔معاشرے اور ریاست کی عدم اسلامائزیشن v۔تعمیر سیرت و کردار کا بحران

۸۔ نئے رول ماڈل تعلیمی اداروں کی ضرورت

۹۔ جدید تعلیم کا رول ماڈل ادارہ

i۔ مقاصدِ تعلیم

ii۔نصاب کی تبدیلی (خصوصاً علوم اسلامیہ اور عمرانی علوم کی اسلامی تشکیل نو)

iii۔ تربیت اساتذہ

iv۔ تربیت طلبہ

v۔ انتظامیہ کی تربیت

vi۔ تعلیمی ادارے کا ماحول

vii۔ ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیاں

۱۰۔ رول ماڈل دینی مدرسہ

i۔ اسلامی علوم پر نظر ثانی/قلّت واضافہ

ii۔ جدید نصابی کتب

iii۔ عصری علوم کا تعارفی مطالعہ

iv۔ انگریزی زبان

v۔ جدید حکومتی ڈگریوں کا حصول

vi۔ فرقہ واریت کا خاتمہ

متفرق امور

۱۔ کلاسیں آن لائن اور فیزیکل دونوں ہوں گی

۲۔ کامیاب طلبہ وطالبات کو سرٹیفکیٹ دیئے جائیں گے۔

برائے رابطہ ورجسٹریشن

حافظ محمد عمران طحاوی 0336-1913636 0300-4107282

ای میل:ermpak@hotmail.com

تفہیم دین/مکالمہ پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

'نظام' کی تبدیلی اور 'خلافت' کی بحالی؟

سوال: ہم نے 'نظام بدلو' کے حوالے سے ایک دستاویز تیار کی ہے، جو ارسالِ خدمت ہے اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ عدنان وہاب خان (لاہور)

جواب: عدنان وہاب خان صاحب پاکستان میں خلافت کی تحریک کے متحرک اور پرجوش نوجوان قائد ہیں۔ بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن کیا کیا جائے؟ اور کیسے کیا جائے؟ یہ ان کے لیے چیلنج ہے۔ حال ہی میں انہوں نے اپنے ہم خیال احباب سے مل کر اور خلافت کی تحریکوں کو متحد کر کے 'تحریک عدل' کے نام سے دینی سیاسی جدوجہد کا پلیٹ فارم بنایا ہے اور 'تھنکرز فورم' کے نام سے ایک واٹس ایپ گروپ بھی تشکیل دیا ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی اس نوعیت کے کام میں دوسرے اہل علم کو شامل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور راقم سے بھی اس میں شمولیت پر اصرار کرتے رہے ہیں۔ وہ خلوص اور سادگی سے یہ سمجھتے ہیں کہ خلافت مسلمانوں کا سیاسی نظام تھا اور اس کی بحالی ہر مسلمان اور ہر دینی کارکن کی خواہش ہونی چاہیے اور اس کے لیے موجودہ اجتماعی اداروں یا نظام (سیاسی نظام، معاشی نظام، عدالتی نظام وغیرہ) کی تبدیلی ضروری ہے۔ لیکن ظاہر ہے، یہ بات اتنی سادہ ہے نہیں اور فکری عمق غالباً ان کے ہاں کم ہے۔

ہم پہلے بحالیٔ خلافت کی تحریک کے فکری پہلوؤں پر کچھ گفتگو کریں گے اور اس کے بعد ان کے 'نظام بدلو' کے منہج اور کام کے بارے میں اپنی رائے دیں گے۔

ا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ 'خلافت' مسلمانوں کے سیاسی نظام کا نام ہے اور سیاست پورا دین نہیں بلکہ دین کا ایک جزو ہے۔ ہم کہا کرتے ہیں کہ یہ دین کا آٹھواں حصہ ہے کہ دین کے عام طور پر چار بڑے شعبے ذکر کیے جاتے ہیں: عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات۔ معاملات کے کئی حصے/شعبے ہیں جیسے مناکحات (عائلی امور)، معاشرت، معیشت اور سیاست وغیرہ۔ گویا معاملات دین کا چوتھا حصہ ہیں اور پھر سیاست معاملات کا چوتھا جزو ہے۔ گویا

سیاست دین کا آٹھواں حصہ ہے اور بلاشبہ بہت اہم حصہ ہے لیکن ظاہر ہے یہ پورا دین نہیں۔

۲۔ خلافت کا خاتمہ اہل مغرب نے ترکوں کے مغرب زدہ عناصر سے کرایا اور اس کے چند سال بعد امام حسن البنا نے مصر میں سیاست کو دینی بنیادوں پر اٹھایا لیکن وہ جلد ہی شہید کر دیئے گئے اور سیاست کو دین میں مبالغے کے ساتھ پیش کرنے کا علمی وفکری کام سید ابوالاعلیٰ مودودی نے کیا اور اس کے لیے 'اقامت دین'، 'حکومت الٰہیہ'، 'اسلامی نظام حیات' اور 'اسلامی انقلاب' جیسی نئی اصطلاحات وضع کیں۔ ان کی فکر کو بلاشبہ دین کی سیاسی تعبیر کہا جاسکتا ہے۔

۳۔ امام حسن البنا اور مولانا مودودی یا بالفاظ دیگر الاخوان المسلمون اور جماعت اسلامی اور دیگر معاصر جدید دینی تحریکوں نے 'خلافت' کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ 'اسلامی ریاست'، 'اسلامی حکومت' اور 'اسلامی جمہوریت' جیسی اصطلاحات استعمال کیں۔ اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ مغرب ہنوز طاقتور اور غالب ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ مسلمان 'خلافت' یا 'امت' جیسی اصطلاحات استعمال کریں جو مسلمانوں کی مرکزیت اور قوت کی خواہاں ہوں۔ اس کی بجائے اس نے نیشنلزم، جمہوریت اور قومی ریاست کا تصور پیش کیا اور اسے اتنی شدّ ومد سے پیش کیا کہ اسے ایک مقدس عقیدہ بنا دیا اور بڑے مسلم ممالک کو توڑ کر انہیں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا تاکہ وہ قوت نہ پکڑ سکیں۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بارے میں جمہور مسلمانوں کی رائے یہ ہے کہ وہ خلافت علی منہاج النبوۃ تھی اور گو دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر بن خطابؓ نے 'خلیفہ' کی بجائے 'امیر المومنین' کا لقب اختیار کر لیا (یعنی مسلمان حکومت کو 'خلافت' کی بجائے 'امارت' بنا دیا) لیکن بعد کی صدیوں میں مسلم نظام حکومت کو بالعموم خلافت کہا جانے لگا، اگرچہ اس میں خلافت راشدہ کے مقابلے میں بہت سی غیر اسلامی باتیں اور رویے در آئے تھے اور انہی خامیوں اور خرابیوں کی وجہ سے بالآخر 'خلافت' کا نظام مسلمان معاشروں میں عدم سیاسی استحکام کا سبب بنا اور مسلم زوال میں اس کا بھی ایک کردار تھا۔

۴۔ عصر حاضر میں خلافت کی بڑی تحریکوں جیسے مشرق وسطیٰ میں 'حزب التحریر' اور پاکستان میں 'تنظیم اسلامی' درحقیقت الاخوان اور جماعت اسلامی ہی کی آف شوٹ ہیں اور گو وہ ان سے کچھ اختلاف بھی رکھتی ہیں جیسے اسلامی جمہوریت اور انتخابات وغیرہ کے بارے میں

لیکن وہ الاخوان اور سید مودودی کی بنیادی فکر یعنی اقامت دین، اسلامی نظام حیات اور اسلامی انقلاب وغیرہ کو قبول کرتی ہیں اور قیامِ اسلامی ریاست/ نفاذِ اسلام/ غلبۂ دین بذریعہ سیاسی جدوجہد کی قائل ہیں۔

ہماری رائے میں بنیادی کمزوری مولانا مودودی کی دینی فکر میں ہے جس میں انہوں نے تبدیلی کا نبوی منہاج یعنی ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ کو چھوڑ کر سیاست کو پورا دین بنا کر پیش کیا اور اس دین کو نافذ اور غالب کرنے کے لیے سیاسی جدوجہد کا راستہ اپنایا اور وہ بھی مغربی جمہوریت کا، بعض کاغذی اسلامی تبدیلیوں کے بعد۔ اور اس منہج کو اپنانے کے نتیجے میں جس طرح جماعت اسلامی کو کامیابی نہیں ملی، اسی طرح خلافت کی تحریکیں بھی کامیاب نہیں ہوئیں اور نہیں ہوسکتیں کیونکہ جب تک فرد اور معاشرے کو تبدل نہ کیا جائے، ریاست کو تبدیل کیا ہی نہیں جاسکتا۔ ابتداء میں مولانا بھی اسی کے قائل تھے لیکن پاکستان میں جب انہیں عملی سیاست کا موقع ملا تو انہوں نے رائے بدل لی۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جمہور علماء اور جمہور امت نے مولانا مودودی کے 'اقامت دین' کے مخصوص نظریے کو تسلیم نہیں کیا بلکہ وہ اسے غلط سمجھتے ہیں اور اسے دین کی غلط تعبیر قرار دیتے ہیں۔ جماعت اسلامی اور خلافت کی تحریکوں کی ناکامی کی تیسری وجہ یہ ہے کہ مغربی فکر وتہذیب کے علمبردار ممالک ان کو ناکام کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کی اسلام اور مسلم دشمنی مسلمہ ہے اور کوئی مضبوط اسلامی ریاست یا کسی مسلمان ملک میں نفاذ شریعت یا غلبۂ دین ان کے لیے قابل برداشت نہیں ہے۔ اس کے لیے ان کی حکمت عملی کثیر جہتی ہے۔ وہ ان کی مخالفت کرتے ہیں اور مغرب زدہ اور گماشتہ مسلمان حکمرانوں کے ذریعے ان کی سرکوبی کراتے ہیں۔ ان کو انتخابات میں کامیاب نہیں ہونے دیتے، ہو جائیں تو انہیں حکومت چلانے نہیں دیتے جیسے الجزائر، مصر، فلسطین میں ہو چکا ہے یا جدید دینی تحریکیں/ خلافت کی تحریکیں اگر مؤثر ہونے لگیں تو ان کے اندر گھس کر ان کو سبوتاژ کرتے ہیں اور ان کے ذریعے انتہا پسندی اور دہشت گردی کرا کے ان کو بدنام اور ناکام کرتے ہیں جیسے داعش، القاعدہ اور پاکستانی طالبان کے ساتھ ہو چکا ۔ خصوصاً داعش کو انہوں نے بہت بدنام کیا تا کہ 'خلافت' کا تصور بدنام ہو جائے اور کوئی دوسری اسلامی تحریک یا ملک 'خلافت' کا نام استعمال کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔

۴۔ مولانا مودودی کا تصور اقامت دین اور غلبۂ دین بذریعہ سیاسی جدوجہد اس لیے صحیح نہیں ہے کہ (۱) وہ قرآن وسنت کے مطابق نہیں ہے وہ (۲) مسلم زوال کے غلط تجزیے اور (۳) مغربی فکر و تہذیب کے خلاف ردّعمل اور (۴) اس سے لاشعوری مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ اب ہم ان چار نکات پر مختصراً روشنی ڈالیں گے۔ (تفصیل ہمارے دیگر مضامین اور کتابوں میں موجود ہے):

۱۔ قرآن حکیم نے نبی کریم ﷺ کو اسلام پھیلانے اور اسے غالب کرنے کا جو لائحہ عمل دیا تھا وہ تھا: ۱۔ تلاوت آیات ۲۔ تعلیم کتاب ۳۔ تعلیم حکمت ۴۔ تزکیۂ نفس۔ تلاوت یعنی پڑھنا چونکہ تعلیم ہی کا حصہ ہوتا ہے اس لیے اختصار سے اس فارمولے کو تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کہا جاسکتا ہے۔ قرآن حکیم نے اسے چار دفعہ بیان کیا ہے [۱] اور یہ بھی بتایا ہے کہ پہلے انبیاء کا طریق کار بھی یہی تھا۔ [۲]

نبی کریم ﷺ کی سنت وسیرت یہی بتاتی ہے کہ آپ نے ۱۳ سال تک مکہ میں تعمیر فرد اور انسان سازی کا کام کیا بذریعہ دعوت، تعلیم اور تزکیہ۔ اس سے جو افراد تیار ہوئے ان کی مدد سے آپ نے مدینہ میں اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست قائم کی کیونکہ معاشرہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے اور ریاست کو بھی افراد ہی چلاتے ہیں لہٰذا جب تک فرد کی تعمیرِ سیرت اسلامی تعلیمات کے مطابق نہ ہو، معاشرے اور ریاست کو اسلامی بنایا ہی نہیں جاسکتا۔

۲۔ مولانا مودودی اور جدید دینی تحریکوں کے قائدین نے مسلمانوں کے زوال کا تجزیہ غلط کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب ملوکیت، تصوف اور علماء کا جمود ہے چنانچہ انہوں نے تصوف کی مخالفت کی، روایتی علماء کو غلط سمجھا اور ملوکیت کی مذمت کرتے ہوئے جمہوریت کی حمایت کی حالانکہ مسلمانوں کے زوال کی بنیادی وجہ ایمان کی کمزوری تھی جس کا سبب تعلیم وتزکیہ کے نظام کا ناقص ہو جانا تھا جس کی وجہ سے فرد کی تعمیر سیرت صحیح خطوط پر نہ ہوئی اور باصلاحیت اور صاحب کردار مسلمان پیدا ہونے بند ہوگئے۔

---

[۱] البقرہ ۲: ۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران ۳: ۱۶۴، الجمعہ ۶۲: ۲

[۲] طٰہٰ ۲۰: ۴۴،۴۳، النازعات ۷۹: ۱۷، ۱۸، الاعلیٰ ۸۷: ۱۴ تا ۱۹

۳۔ سید مودودی اور بعض جدید دینی مفکرین کے نزدیک مسلمانوں کی پہلی جنگ عظیم میں شکست، خلافت کے خاتمے اور مسلمانوں کے زوال کی وجہ ایک مضبوط اسلامی ریاست کا عدم وجود تھا جب کہ اہل مغرب اس وقت برطانیہ (جس کی سلطنت میں اس وقت سورج غروب نہیں ہوتا تھا)، فرانس، جرمنی، اٹلی میں عظیم سلطنتیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ان حالات میں بعض مسلم مصلحین نے سوچا کہ عظیم اسلامی مملکت کا قیام اور سیاسی غلبہ ہی ہی مسلمانوں کے مسئلے کا بنیادی حل ہے گویا ان کی فکر ردعمل تھی مغرب کے غلبے کا۔لہٰذا اب جو اسلامی تحریک بھی اٹھتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ جب تک اقتدار اور حکومت اسے نہیں ملے گا، اسلام غالب نہیں آسکتا اور اسلام کو غالب کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ حکومت اور اقتدار ملے تو وہ شریعت نافذ کریں۔

۴۔ سید مودودی اور جدید دینی تحریکوں نے جب نفاذ شریعت بذریعہ اسلامی ریاست کو مسئلے کا حل سمجھا اور مسلمان ریاستوں میں اقتدار تک پہنچنے کا راستہ مغرب نے اپنی لادین جمہوریت کو بنا رکھا تھا تو وہ سمجھے کہ اب مجبوراً انہیں سیاست میں حصہ لینے اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے جمہوریت کو قبول کرنا پڑے گا چنانچہ انہوں نے وہ قبول کر لی۔ پاکستان میں انہوں نے کوشش کر کے کچھ کاغذی اسلامی اصول حکمرانوں سے منوا لیے اور یوں انہوں نے سمجھا کہ اب جمہوریت اسلامی ہوگئی ہے۔اکثر مسلم ممالک میں یہ بھی نہ ہوسکا اور مغرب کی لادین سرمایہ دارانہ جمہوریت ہی پر عمل انہوں نے شروع کر دیا۔اس غلط فیصلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پچھلی ایک صدی میں کسی مسلمان ملک میں جمہوریت/ اسلامی جمہوریت کے ذریعے اسلام غالب نہیں آسکا اور نہ شریعت نافذ ہوسکی ہے اور نہ ہماری رائے میں ہوسکتی ہے اور نہ آئندہ اس کا کوئی امکان ہے بلکہ اسلام کی جگہ مغرب کا سیکولرزم، لبرل ازم اور سرمایہ دارانہ نظام غالب آچکا ہے جو ان دینی تحریکوں کے منہج کا منطقی نتیجہ ہے۔

ان چار وجوہ سے پاکستان میں اسلام 'نافذ' نہیں ہوسکا اور نہ خلافت کا راستہ ہموار ہوا ہے کیونکہ بنیادی فکر ہی غلط ہے۔اسلام کے غلبے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے مسلمانوں کو صحیح اور سچا مسلمان بناؤ (جس کا طریقہ تعلیم، دعوت اور تزکیہ ہے) تاکہ وہ دل سے اسلامی تعلیمات پر عمل کریں، مغربی تہذیب کی پیروی چھوڑ دیں اور اسلامی معاشرہ و اسلامی ریاست قائم کرنا

چاہیں تو پھر ہی اسلام غالب آئے گا۔ اسلام 'نافذ' کرنے کی چیز نہیں عمل کرنے کی چیز ہے۔ جب مسلمان اپنی انفرادی زندگی میں اسلام پر عمل کریں گے اور اجتماعی زندگی میں بھی کرنا چاہیں گے تو پھر ہی اسلامی تبدیلی آئے گی۔ محض اسلامی قانون بنا دینے سے یا اقتدار مل جانے سے اسلام غالب نہیں آ سکتا۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہمیں 'اسلامی ریاست' عدم سے وجود میں نہیں لانی۔ الحمدللہ! پچھلے ۱۴۰۰ سال سے مسلم معاشرہ اور مسلم حکومتیں قائم ہیں۔ عوام بھی مسلمان ہیں اور حکمران بھی۔ پاکستان میں ۹۷.۳ فیصد لوگ مسلمان ہیں۔ حکمران بھی مسلمان ہیں لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم عوام کی اور مسلم حکمرانوں کی اصلاح کی جائے، ان کو صحیح معنوں میں اچھا اور باعمل مسلمان بنایا جائے۔ جب وہ سچے مسلمان بن جائیں گے تو ان کی انفرادی زندگی میں بھی اسلام آ جائے گا اور اجتماعی زندگی میں بھی۔ معاشرہ بھی اسلامی ہو جائے گا اور حکومت بھی۔ بنیادی کام انسان سازی اور ان کی تعمیر سیرت کا ہے جو نبی کریم ﷺ نے تعلیم وتزکیہ کے ذریعے ہمیں کر کے دکھا دیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کی جائے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کی نصرت بھی ہمیں حاصل ہو گی۔

ہم نے طویل بحث کو چند صفحات میں سمیٹ دیا ہے اس لیے ممکن ہے کہ اجمال کی وجہ سے ہر بات کی وضاحت نہ ہو سکی ہو تاہم ہماری مطبوعہ تحریروں میں کئی جگہ یہ بحث پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور دیکھی جا سکتی ہے۔ جیسے 'مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل'، 'خاموش انقلاب'، 'پاکستان میں دینی قوتوں کی ناکامی کے اسباب' اور 'مسلمانوں کو درپیش دو بنیادی چیلنجز' وغیرہ۔

اب آیئے اس دستاویز کی طرف جو ''نظام بدلو'' کے نام سے عدنان وہاب صاحب نے ہمیں بھیجی ہے اور انگریزی کے ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے (انگریزی میں کیوں؟ اور انگریزی بھی ایسی جو ابھی قابل نظر ثانی ہے)۔ اس میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ موجودہ سیاسی، معاشی، عدالتی نظام غلط ہے اور ڈیلیور نہیں کر پا رہا۔ اس کے بعد مرتبین نے اسلام کے سیاسی، معاشی، عدالتی نظام کے خدوخال مختصر نکات کی صورت میں مدون کر دیے ہیں۔

یہاں 'نظام بدلو' کے حوالے سے دو باتوں پر غور ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ نظام کون بدلے گا؟ یعنی ایسی حکومت کیسے وجود میں آئے گی جو موجودہ نظام کو بدلنا چاہے۔

موجودہ 'اسلامی جمہوریت' کے ذریعے تو پچھلے ۷۵ سال میں 'نظام' کو نہیں بدلا جا سکا اور نہ اسے اسلامی بنایا جا سکا ہے اور نہ عقل و منطق کی رو سے آئندہ ۷۵ سال میں اس کا امکان ہے تو آپ کے پاس کیا گیدڑ سنگھی یا جادو کا بٹن ہے کہ آپ اسے دبائیں گے تو موجودہ حکمران اسلامی ہو جائیں گے یا حقیقی اسلامی ذہن رکھنے والے لوگ برسر اقتدار آ جائیں گے اور آ کر 'صحیح اسلامی نظام' نافذ کر دیں گے؟

دوسری بات یہ کہ ایسا 'اسلام کا سیاسی نظام'، 'اسلام کا معاشی نظام' اور 'اسلام کا عدالتی نظام' ہے کہاں جسے آپ برسر اقتدار آ کر نافذ کر دیں گے؟ یہاں کچھ باتیں ذہن میں رکھنے کی ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کوئی سیاسی نظام، معاشی نظام، عدالتی نظام ہمیں نہیں دیا بلکہ صرف کچھ بنیادی اصول (Principles of Policy) دیے ہیں اور الوہی حکمت ودانش سے تفصیلی نظام عمداً نہیں دیا (کیونکہ اگر دے دیا جاتا تو وہ زمان ومکان کی تبدیلی سے ناقابل عمل ہو جاتا) بلکہ اسے امت اور اس کے اہل علم ودانش یعنی مجتہدین پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنی زمانی ومکانی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان اصولوں پر مبنی اور ان کی روشنی میں تفصیلی ڈھانچہ تشکیل دے لیں۔

۲۔ یہ کام مسلمانوں نے اپنے ہزار سالہ دورِ حکومت میں کیا اور اسلامی قانون (فقہ) کو قابل عمل رکھا۔ اور یہ کام صرف ایک دفعہ کر لینے کا نہیں بلکہ یہ مسلسل جاری رہنے والا تغیر پذیر عمل ہے۔ نئے حالات میں نئے سوالات ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے اور مجتہدین اس میں مسلم معاشرے اور حکومت کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

۳۔ ماضی میں مسلم فقہاء نے جو کام کیا اور مسلم حکمرانوں اور حکومتوں نے اس پر جس طرح عمل کیا وہ قابل قدر ہے لیکن وہ آج قابل عمل نہیں اور نئے حالات میں نئے اجتہاد کی ضرورت ہے۔

لہٰذا آج یہ کام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن وسنت اور علوم اسلامیہ کے ماہرین اور

متعلقہ شعبے کے ماہرین مل بیٹھیں اور اجتہادی سپرٹ کے ساتھ مندرجہ ذیل لائحہ عمل کے مطابق کام کریں:

i۔ وہ قرآن وسنت کے اصولوں اور تعلیمات کو سامنے رکھیں (جو ہمیشہ کے لیے قابل عمل ہیں)۔

ii۔ وہ امت کے ہزار سالہ دور میں ہونے والے علمی کام اور عملی تجربات کو سامنے رکھیں۔

iii۔ وہ مسلم معاشرے کی ضروریات کو پیش نظر رکھیں۔

iv۔ وہ عصر حاضر کی غالب دہریہ مغربی فکر وتہذیب کی عدم پیروی کا عہد کر کے بیٹھیں۔

v۔ ہر شعبے کے ماہرین علماء وماہرین ومتخصصین کی اس طرح کی مستقل کمیٹی ہو اور وہ ہمیشہ کام کرتی رہے تاکہ چیزیں اپ ٹو ڈیٹ ہوتی رہیں اور نئے مسائل ومشکلات کا حل ساتھ ساتھ دیا جاتا رہے۔

یہ کام اتنا عظیم ہے کہ حکومت کے کرنے کا ہے لیکن موجودہ حکومتوں سے یہ توقع کرنا ہی فضول ہے کہ وہ یہ کام کریں گی۔ دوسرے درجے میں یہ کام اسلامی تنظیموں اور اداروں (دینی سیاسی جماعتوں، اصلاحی دینی تحریکوں، دینی مدارس وغیرہ) کے کرنے کا ہے لیکن کسی کی اس طرف توجہ نہیں۔ راقم آثم عرصے سے یہ کام کرنے کی خواہش رکھتا ہے لیکن مادی اور افرادی قوت کی کمی آڑے آتی ہے اور یہ محض خواب بن کے رہ گیا ہے۔

عدنان صاحب اور ان کے دوستوں نے جو تجاویز اس دستاویز میں دی ہیں، ان میں اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے ایک اہم نکتے کی طرف ان کی توجہ مبذول کرتے ہوئے ہم اس بحث کے خاتمے کی طرف آتے ہیں۔

انہوں نے عصر حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام کی جو تفصیلات دی ہیں ان میں خلیفہ/ امیر المومنین کو سارے اختیارات کا مرکز بنا دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ قرآن وسنت کا حکم ہے؟ ہمارے خیال میں ایسا نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک اجتہادی امر ہے۔ خلافت راشدہ کے فیصلے سر آنکھوں پر اور قابل صد احترام لیکن ان میں جو فیصلے اجتہادی تھے، انہیں آج ویسے کا ویسا

نافذ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ آج حالات بدل چکے ہیں اور اصول فقہ کا مشہور قاعدہ ہے کہ 'الحکم یدور مع العلۃ' یعنی علت بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے۔ اگر حکمران حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ جیسے ہوں تو انہیں سارے اختیارات عمر بھر کے لیے دیے جاسکتے ہیں لیکن اگر آپ مغرب کے مسلط کردہ زرداری اور نواز شریف جیسے لوگوں کو وہ سارے اختیارات عمر بھر کے لیے دے دیں گے جو حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے پاس تھے تو وہ ایک عذاب ہوگا، جہنم کے عذاب جیسا (جس سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں) چنانچہ جو مجتہدین و ماہرین آج اسلام کے سیاسی نظام کی تفصیلات وضع کرنے بیٹھیں، انہیں اس کا لحاظ کرنا چاہیے۔

اللہ کرے ہماری یہ گزارشات عدنان صاحب اور دوسرے لوگوں کے لیے غور وفکر کا باعث بنیں۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العٰلمین۔

بقیہ: ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے متعلق ایک اہم فقہی مسئلہ

"وَالْمُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ إِلَّا شَرْطًا حَرَّمَ حَلَالًا أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا۔"[1]

''اور مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں سوائے ایسی شرط کے جو کسی حلال کو حرام کردے یا کسی حرام کو حلال۔''

مذکورہ بالا تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ بیوہ کا اپنے فوت شدہ شوہر کے ساتھ نطفہ کو استعمال کرنا، اختتام نکاح اور معاہدہ، دونوں کی بنا پر نا جائز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

جب تولیدی علاج کی مختلف صورتوں کا جواز بوقتِ حاجت اور بطور علاج ہی ہے تو ضروری ہے کہ ہسپتالوں کی انتظامیہ کو تولیدی جرثومے لمبے عرصے تک محفوظ کرنے کی سہولت بھی ختم کرنی چاہیے، کیونکہ اس سے بے شمار نئے مسائل پیدا ہونے کا امکان ہے اور ان جرثوموں کی حفاظت علاج سے بڑھ کر بہت سے شوقیہ رجحانات کو بھی جنم دے رہی ہے۔ شریعت اسلامیہ میں علاج کی یہ گنجائش من مانی اور خواہشات پوری کرنے کی بجائے سنگین صورتحال میں بقدر ضرورت ہی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

---

[1] جامع الترمذی: أَبْوَابُ الْأَحْكَامِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ (بَابُ مَا ذُكِرَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي الصُّلْحِ بَيْنَ النَّاسِ)، رقم 1352

فقہ و قانون

حافظ ڈاکٹر حسن مدنی [1]

ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے متعلق ایک اہم فقہی مسئلہ

اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان نے دو صفحات پر مشتمل ایک سوال نامہ ارسال کیا، جس کے آخر میں استفسار کیا ہے کہ

سوال نمبر 1: کیا شرعاً شوہر کی وفات کے بعد جنین کی پیوند کاری رمنتقلی سابقہ بیوی (بیوہ) کی بچہ دانی میں کی جاسکتی ہے؟ جبکہ شوہر کی زندگی میں انڈے (بیوی کا بیضہ) حاصل کئے گئے، ان کی زرخیزی کی گئی اور جنین تیار کئے گئے۔

سوال نمبر 2: اگر شریعت مذکورہ بالا امر کی اجازت دیتی ہے تو اس معاہدے کا کیا ہوگا جو میاں بیوی نے ہسپتال میں کیا تھا۔ [2]

جواب

سوال نامے میں درج تفصیلات سے علم ہوتا ہے کہ خیبر پختونخواہ سے تعلق رکھنے والے محمد اسفر اور اسناز نامی شادی شدہ جوڑے نے اپنے جرثومہ اور بیضہ کا، فطری کی بجائے سائنسی طریقے سے ملاپ کرایا اور جب وہ چند روز کے بعد نطفہ بن گیا تو اس کو ہسپتال میں منجمد کرا لیا۔ اب شوہر کی وفات کے بعد بیوہ عورت کا اس کو اپنے رحم میں رکھنا کیا شرعاً جائز ہے؟

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا جواز اور شرائط

مردانہ جرثومہ اور نسوانی بیضہ کو قرآن وسنت میں مَاء اور ان دونوں مَاء (پانی) کے ملاپ کے بعد اگلے مرحلے کو نُطفة کہا جاتا ہے جس کے بعد تخلیق کے کئی مراحل آتے ہیں اور پیدائش سے قبل کے ان تمام مراحل پر جَنین کا لفظ بولا جاتا ہے۔

---

[1] مہتمم جامعہ رحمانیہ لاہور، پروفیسر علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب

[2] اسلامی نظریاتی کونسل کا مراسلہ نمبر: ایف 1(88)/2022ء۔آر۔سی آئی آئی/42، ص 2، مؤرخہ 12/اپریل 2023ء

فقہ اسلامی کا مسلّمہ اصول ہے کہ معاملات میں اصل حلّت ہے، جب تک اس کی حرمت کی واضح شرعی دلیل نہ ہو۔ مصنوعی طریقۂ تولید کی ایک صورت 'ٹیسٹ ٹیوب بے بی (IVF) کے بارے میں برصغیر کے اکثر حنفی علما حرمت کے قائل ہیں جیسا کہ دار العلوم دیو بند، انڈیا[1] اور دار العلوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن، کراچی کا یہی موقف ہے جس کی وجہ یہ مفتیان حضرات بلاضرورت خاتون کے ستر کو کھولنا قرار دیتے ہیں، جبکہ دار الافتاء اہل سنت (دعوتِ اسلامی) کراچی [2] نے صرف شوہر بیوی کے مابین اس کی اجازت دی[3] ہے، اور جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور کے مہتمم مفتی عبد القیوم ہزاروی نے بھی زوجین کے مابین ٹیسٹ ٹیوب کو جائز[4] قرار دیا ہے۔ حالانکہ ٹیسٹ ٹیوب کو اگر علاج مان لیا جائے اور علاج کے تقاضوں کے تحت بامر مجبوری خاتون ڈاکٹر یا مرد ڈاکٹر شرعی احتیاطوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو انجام دیں تو اس کا جواز مزید واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سعودی عرب کی مشہور فقہ اکیڈمی، جدہ کے فیصلے کا متن یہ ہے کہ

"الأصل أنه إذا توافرت طبيبة متخصصة، يجب أن تقوم بالكشف على المريضة، وإذا لم يتوافر ذلك، فتقوم بذلك طبيبة غير مسلمة ثقة، فإن لم يتوافر ذلك يقوم به طبيب مسلم، وإن لم يتوافر طبيب مسلم، يمكن أن يقوم مقامه طبيب غير مسلم. على أن يطّلع من جسم المرأة على قدر الحاجة فى تشخيص المرض ومداواته، وألا يزيد عن ذلك، وأن يغض الطرف قدر استطاعته، وأن تتم معالجة الطبيب للمرأة هذه: بحضور محرم أو زوج أو

---

[1] https//:darulifta-deoband.com/home/ur/women-ssues/171218
مؤرخہ 20/اپریل 2023ء

[2] https//:daruliftaahlesunnat.net/ur/2117
مؤرخہ 20/اپریل 2023ء

[3] https//:www.banuri.edu.pk/readquestion/16-09-2017Fatwa 144405100577
20اپریل 2023ء

[4] https//:thefatwa.com/urdu/questionID/2416/

امرأة ثقة، خشية الخلوة "[۱]

''اصل یہ ہے کہ جب سپیشلسٹ خاتون ڈاکٹر موجود ہو تو مریضہ کا ستر کھولنا اسی پر واجب ہے۔ اگر ایسی خاتون ڈاکٹر نہ ہو تو یہ علاج معتمد غیر مسلم خاتون ڈاکٹر سے کرایا جائے۔ اگر وہ بھی نہ ملے تو مسلمان ڈاکٹر، وہ بھی دستیاب نہ ہو تو غیر مسلم ڈاکٹر یہ آپریشن کر سکتا ہے۔ ڈاکٹرز کو چاہیے کہ خاتون کے جسم میں سے بقدرِ ضرورت مرض کی تشخیص اور علاج کے لیے کھولے۔ اس پر کوئی اضافہ نہ کرے اور بقدرِ استطاعت نگاہوں کو جھکا کر رکھے۔ اور مرد ڈاکٹر، خاتون کا ایسا علاج محرم مرد، شوہر یا کسی عورت کی موجودگی میں کرے تاکہ خلوت کے مسائل پیدا نہ ہوں۔''

سعودی عالم شیخ محمد بن صالح عثیمین نے بہ امر مجبوری ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے مشروط جواز کا فتوی دیتے ہوئے فرمایا کہ

إذا كان لهذا العمل حاجة: فإننا لا نرى به بأسًا بشروط ثلاثة:...

الثالث: أن توضع البويضة بعد تلقيحها في رحم الزوجة، فلا يجوز أن توضع في رحم امرأة سواها بأي حال من الأحوال، لأنه يلزم منه إدخال ماء الرجل في رحم امرأة غير حلال له، وقد قال الله تعالى: ﴿نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ البقرة/223، فخصّ الحرث بامرأة الرجل، وهذا يقتضي أن تكون المرأة غير الزوجة غير محل لحرثه."[۲]

''اگر اس علاج کی حاجت ہو تو ان تین شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے:

اوّل: اس امر میں پوری احتیاط کی جائے اور اس کو یقینی بنایا جائے کہ جرثومہ اور بیضہ زوجین کا ہی ہو، اس میں کسی اور اختلاط یا امتزاج کا امکان نہ ہو۔

---

[۱] مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی، جدۃ: عدد 8، ج1/ص49

[۲] مجموع فتاوی الشیخ العثیمین: 17/ص27، 28

دوم: مرد کا مادہ منویہ جائز طریقہ سے ہی حاصل کیا جائے، جیسا کہ بیوی کی ٹانگوں یا ہاتھوں وغیرہ کے ذریعے

سوم: بیضہ کو جرثومہ سے ملاپ کے بعد، بیوی کے رحم میں ہی رکھا جائے۔ یہ جائز نہیں کہ کسی بھی صورت میں اس کو کسی اور عورت کے رحم میں رکھا جائے۔ کیونکہ اس سے آدمی کا پانی ایسی عورت کے رحم میں پہنچنا لازم آئے گا جو اس کے لئے حلال نہیں ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں، اپنی کھیتوں میں جس طرح چاہو آؤ اور اپنے لیے (نیک اعمال) آگے بھیجو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اور جان رکھو کہ تم اس سے ملنے والے ہو اور ایمان والوں کو خوشخبری دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے کھیتی کو آدمی کی بیوی کے ساتھ خاص کر دیا اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی کے سوا دوسری عورت، بیج ڈالنے کے لئے ناجائز مقام ہے۔''

جائز رحم ہونے کی لازمی شرط

پیدائش کے ان مراحل کے بارے میں نبی کریم ﷺ کی یہ واضح ہدایت بھی موجود ہے جو سیدنا رویفع بن ثابت انصاری سے مروی ہے کہ

"لَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَسْقِيَ مَاءَهُ زَرْعَ غَيْرِهِ۔"[1]

''جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اس کے لیے حلال نہیں کہ کسی دوسرے کی کھیتی کو اپنا پانی دے۔''

اس فرمانِ نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنا پانی (جرثومہ)، کسی دوسرے کی کھیتی کو پلائے۔ اور سورۃ البقرۃ کی آیت 223 میں اپنی بیوی کو ہی 'کھیتی' قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ کوئی مسلمان اپنے لئے ناجائز رحم میں اپنا پانی (جرثومہ) نہیں ڈال/رکھ سکتا۔ ایسا صرف اسی صورت میں جائز ہے، جب وہ مسلمان اپنی بیوی کے رحم میں اپنا جرثومہ رکھے۔ چنانچہ بیضہ والی عورت کی بجائے دوسری عورت کا رحم (Surrogacy)

---

[1] سنن أبي داود: كتاب النكاح (باب في وطء السبايا)، رقم 2158

استعمال کرنے کی وہی صورت جائز ہے جس میں دوسری عورت بھی اس مسلمان کی بیوی ہو، یعنی دونوں خواتین میں سوکن کا رشتہ ہو یا وہ عورت اس مسلمان کی باندی ہو۔ مفسر قرآن مولانا عبد الرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں کہ:

''ایک مرد کی دو یا دو سے زائد بیویاں ہیں جن میں سے کوئی ایک بانجھ ہے۔ اس بانجھ عورت کا بیضہ حاصل کر کے ٹیسٹ ٹیوب میں مرد کا نطفہ شامل کر کے کسی تندرست بیوی کے رحم میں یہ 'نطفہ امشاج' رکھ دیا جائے۔ یا اس کے برعکس یعنی اگر بانجھ عورت کے بیضہ یعنی جرثومہ میں نقص ہے تو وہ کسی دوسری بیوی کا لے کر یہی طریق کار استعمال کر کے بانجھ عورت کے رحم میں رکھ دیا جائے۔ اس طریق کار میں کچھ قباحت نہیں۔ اس کا نسب تو بہرحال باپ سے ہی چلے گا۔ لیکن وراثت کا تعلق اس ماں سے ہوگا جس نے اسے جنا ہے۔ ان کے علاوہ باقی جتنی بھی شکلیں بنتی ہیں (اور وہ بہت سی بن جاتی ہیں) سب قطعی طور پر حرام ہیں۔'' [1]

22 رفروری 2017ء کو وفاقی شرعی عدالت، پاکستان نے بھی اپنے ایک فیصلہ میں یہی موقف اختیار کیا کہ:

''اگر بچے کی پیدائش کی وجہ بننے والا سپرم [جرثومہ] اس کے قانونی والد ہی کا ہو اور بیضہ اس کی والدہ کا، جو متعلقہ مرد کی بیوی ہو، تو ایسی صورت میں طبی طریقۂ کار سے مصنوعی حمل ٹھہرانے کے بعد اگر ایمبر یو دوبارہ اس بچے کی حقیقی والدہ ہی کے رحم میں رکھا جائے، تو یہ طبی عمل مذہبی حوالے سے بھی، قانون کے مطابق اور جائز ہوگا۔

وفاقی شرعی عدالت کے 22 صفحات پر مشتمل اس فیصلے کی تفصیلات میں لکھا ہے کہ عدالت کے مطابق اگر متعلقہ مرد اور عورت آپس میں شادی شدہ ہوں اور مصنوعی حمل یا IVF نامی طبی عمل کے لیے انہی کے تولیدی خلیات استعمال کیے جائیں تو یہ عمل نہ تو غیر قانونی ہوگا اور نہ ہی قرآن وسنت کے احکامات کے منافی۔

اس سے قبل 2013ء میں پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی کہا تھا کہ اسلام میں

---

[1] مقالہ 'انسانی پیدائش کے لیے مصنوعی تخم ریزی' از مولانا عبد الرحمن کیلانی، ماہ نامہ محدث لاہور، شمارہ دسمبر 1987ء

ٹیسٹ ٹیوب بچوں کی پیدائش کی اجازت تو ہے لیکن چند مخصوص شرائط پوری کرنے کے بعد۔"[۱]

مذکورہ تفصیلات سے علم ہوا کہ اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت، پاکستانی اور سعودی علماء، اور پاکستان کے بعض حنفی علما بعض شرائط کے ساتھ بوقتِ ضرورت ٹیسٹ ٹیوب بے بی IVF کو درست اور جائز قرار دیتے ہیں۔

زوجین میں سے ایک کی وفات کے بعد رشتہ ازدواج کی حیثیت؟

یہ امر تو واضح ہوگیا کہ زوجین کے لئے بعض شرعی احتیاطوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تولیدی علاج کے ان مراحل کو اختیار کرنا جائز ہے۔ پیش نظر سوال میں غور طلب امر یہ ہے کہ وفات کے بعد کیا بیوہ عورت اپنے سابقہ شوہر سے بنایا ہوا نطفہ استعمال کرسکتی ہے اور آیا یہ عورت اپنے فوت شدہ شوہر کے لئے جائز رحم (کھیتی) ہے یا نہیں؟

فقہ اسلامی کے مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد، میاں بیوی میں رشتۂ ازدواج ختم ہوجاتا ہے۔ اگر یہ رشتہ ازدواج باقی رہتا تو فوت شدہ شوہر کے مال سے بیوی کے لئے نفقہ اور سکنیٰ (رہائش) ادا کرنا بھی ضروری ہوتا، اور بیوہ کے لئے دوسرے شوہر سے نکاح کرنا بھی ناجائز ہوتا، جس کا مسلمانوں میں کوئی بھی قائل نہیں۔ چنانچہ

۱۔ کویتی موسوعہ فقہیہ میں ہے کہ

انْتِهَاءُ النِّكَاحِ: يَنْتَهِي النِّكَاحُ وَتَنْفَصِمُ عُقْدَتُهُ بِأُمُورٍ:...

أ) الْمَوْتُ: تَنْحَل رَابِطَةُ الزَّوْجِيَّةِ إِذَا مَاتَ أَحَدُ الزَّوْجَيْنِ. وَلَكِنَّهُ مَعَ ذَلِكَ يَتَرَتَّبُ عَلَى النِّكَاحِ الَّذِي انْتَهَى بِالْمَوْتِ أَحْكَامٌ مِنْهَا: أَنَّ مَنْ بَقِيَ مِنَ الزَّوْجَيْنِ يَرِثُ مَنْ مَاتَ مِنْهُمَا، وَأَنَّ الزَّوْجَةَ تَحُدُّ وَتَعْتَدُّ إِنْ تُوُفِّيَ الزَّوْجُ... ب) الطَّلاَقُ، ج) الْخُلْعُ:...[۲]

"نکاح کا اختتام اور اس کی گرہ بعض اُمور کی بنا پر کھل جاتی ہے۔ (1) پہلا سبب مَوت

---

[۱] https//:www.dw.com/ur/a-37674672

مؤرخہ 18/اپریل 2023ء

[۲] الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ: 41/302، ناشر: وزارۃ الاوقاف، الکویت

ہے: اگر زوجین میں سے کوئی ایک فوت ہوجائے تو ازدواجی تعلق ختم ہوجاتا ہے۔ تاہم موت کی بنا پر ختم ہونے والے نکاح میں بعض شرعی احکام کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے: جن میں سے یہ ہے کہ زوجین میں سے زندہ رہ جانے والے کو فوت شدہ کی وراثت میں سے حصہ ملتا ہے۔ اور فوت شدہ شوہر کی بیوی کے لئے ضروری ہے کہ اظہارِ افسوس کے طور پر شوہر کے لئے عدت گزارے۔ (2) نکاح ختم ہوجانے کا دوسرا سبب طلاق اور (3) تیسرا سبب خُلع ہے۔''

۲۔ انٹرنیٹ پر فتاوی کی عظیم ویب سائٹ 'اسلام ویب' پر یہ فتوی پوچھا گیا کہ عدت گزار لینے کے بعد کیا زوجین میں ازدواجی تعلق ختم ہوجاتا ہے، اور کیا شوہر دوبارہ غیر محرم بن جاتا ہے۔ کیا سابقہ شوہر سے علیحدگی میں ملنا اور شہوت سے اس کی طرف دیکھنا ناجائز ہوجاتا ہے؟ یا دوسرے شوہر سے شادی نہ کرنے تک مطلقہ یا بیوہ عورت سابقہ شوہر کی ہی بیوی رہتی ہے؟

فتوی نمبر 306868: شوہر کی وفات کی صورت میں ازدواجی تعلق ختم ہوجاتا ہے، جیسا کہ موسوعہ فقہیہ میں ہے کہ

وَانْفِصَال الزَّوْجَيْنِ يَكُونُ بِوَاحِدٍ مِنْ ثَلاَثَةِ أُمُورٍ: الْفَسْخِ أَوِ الاِنْفِسَاخِ، وَالطَّلاَقِ، وَالْمَوْتِ. (41/7) وكون المرأة في عدتها من وفاة زوجها لا يعني عدم انقطاع العصمة، والعدة شرعت لحكم ومصالح عظيمة، ومنها الوفاء للزوج والتأكد من براءة الرحم ونحو ذلك من الأغراض الصحيحة. وإذا انقضت العصمة بالموت لم يكن من سبيل شرعي لاستمتاع الحي من الزوجين بالآخر سواء بالنظر أو التخيل ونحو ذلك.[1]

''زوجین کی جدائی تین طریقوں میں کسی ایک صورت میں ہوسکتی ہے: فسخ نکاح، طلاق یا کسی ایک کی موت۔ اور شوہر کی وفات پر عورت کے عدت میں ہونے سے ازدواجی پاکیزگی / رعایت لازم نہیں آتی (یعنی رشتہ نکاح بیوہ کی عدت کے دوران باقی نہیں رہتا)۔ کیونکہ عدت کی بہت سی شرعی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں، جن میں سے شوہر سے وفا اور رحم کے خالی ہوجانے

[1] https://:www.islamweb.net/ar/fatwa/306868
مؤرخہ 18/اپریل 2023ء

وغیرہ جیسی بہت سی مصلحتیں شامل ہیں۔ اور جب موت کے ساتھ ازدواجی رعایتیں ختم ہو گئیں تو زوجین میں کسی زندہ کے لئے دوسرے سے لذت اُٹھانا جائز نہیں، چاہے آنکھوں سے دیکھنا ہو یا اس کو سوچنا وغیرہ ہو۔''

۳۔ بعض فقہا کے نزدیک تو وفات کے بعد میاں بیوی کا ایک دوسرے کو غسل دینا بھی مناسب نہیں۔ جیسا کہ

ذَهَبَ الْحَنَفِيَّةُ فِي الْأَصَحِّ، وَهُوَ رِوَايَةٌ عَنْ أَحْمَدَ إِلَى أَنَّهُ لَيْسَ لِلزَّوْجِ غُسْلُهَا، وَإِلَيْهِ ذَهَبَ الثَّوْرِيُّ، لأَنَّ الْمَوْتَ فُرْقَةٌ تُبِيحُ أُخْتَهَا وَأَرْبَعًا سِوَاهَا، فَحَرَّمَتِ الْفُرْقَةُ النَّظَرَ وَاللَّمْسَ كَالطَّلاَقِ.[۱]

''حنفیہ کا صحیح ترین موقف یہ ہے اور یہی امام احمد سے بھی ایک روایت ہے کہ شوہر، فوت شدہ بیوی کو غسل نہیں دے سکتا۔ یہ موقف امام سفیان ثوری کا بھی ہے۔ کیونکہ موت ایسی جدائی ہے جس کی بنا پر فوت شدہ کی بہن یا چوتھی بیوی سے نکاح کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ موت کی اس جدائی نے، فوت شدہ بیوی کی طرف دیکھنا اور اسے چھونا اسی طرح حرام کر دیا جیسے طلاق کے بعد بیوی حرام ہو جاتی ہے۔''

تاہم یہ حنفی فقہا کا موقف ہے جبکہ مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ اس کے جواز کے قائل ہیں، کیونکہ احادیث و آثار میں اس کی اجازت ملتی ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ عائشہ صدیقہؓ کو فرمایا کہ

"...فَغَسَّلْتُكِ وَكَفَّنْتُكِ..."[۲] تمہیں خود غسل دوں گا، خود کفن پہناؤں گا۔''

اور سیدنا ابوبکر صدیق کو وفات کے موقع پر ان کی اہلیہ اسماء بنت عمیسؓ نے غسل دیا[۳]، اور سیدنا علی نے سیدہ فاطمہؓ کو غسل دیا[۴]، اور صحابہ کرام میں کسی نے ان کا انکار نہ کیا تو پتہ چلا

---

[۱] حاشیۃ ابن عابدین: 1/ 575، وبدائع الصنائع: 1/ 305 بحوالہ الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ: 13/ 58

[۲] سنن ابن ماجہ: كِتَابُ الْجَنَائِزِ (بَابُ مَا جَاءَ فِي غُسْلِ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ، وَغُسْلِ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا)، 1465، حسن

[۳] موطا امام مالک، الجنائز، باب غسل المیت، والسنن الکبریٰ للبیہقی: 3/ 397

[۴] سنن الدارقطنی، الجنائز، باب الصلاۃ علی القبر، والسنن الکبریٰ للبیہقی: 3/ 396

کہ یہ امر ضرورت شوہر کا اپنی فوت شدہ بیوی کو غسل دینے کے جواز پر اجماعِ صحابہ ہے۔ امام محمد بن یزید ابن ماجہ (م 273ھ) کے مذکورہ فرمانِ نبوی پر قائم کردہ باب کے عنوان سے بھی یہی تاثر ملتا ہے کہ زوجین کے لئے ایسا کرنا جائز ہے:

بَابُ مَا جَاءَ فِي غَسْلِ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ، وَغَسْلِ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا۔

''شوہر کا اپنی بیوی کو اور بیوی کا اپنے شوہر کو غسل دینے کے بارے میں باب''

مذکورہ تفصیل سے علم ہوتا ہے کہ وفات کی بنا پر زوجین میں رشتہ ازدواج ختم ہوجاتا ہے، اور اس بنا پر بیوہ عورت کے لئے جائز نہیں کہ فوت شدہ شوہر کا پانی، اس کی وفات کے بعد اپنے رحم میں رکھوائے۔

مطلقہ اور بیوہ کے احکام میں فرق

تاہم حنفی علما کا یہ موقف کہ بیوہ عورت کے احکام سراسر مطلقہ عورت والے ہیں، کی احادیثِ نبویہ سے تائید نہیں ہوتی۔ مطلقہ عورت سے شوہر اپنے مرضی سے رشتہ ازدواج ختم کرتا ہے، جبکہ بیوہ عورت سے یہ رشتہ اللہ تعالیٰ کے فیصلۂ موت کی بنا پر نہ چاہتے بھی ختم ہوجاتا ہے۔ چنانچہ شوہر کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی کے بارے میں دلچسپی لے، اس کے خیال اور تذکرے سے لطف واطمینان حاصل کرے، اس کی طرف نگاہ بلند کرے، جبکہ بیوہ زوجین کے لئے یہ ساری چیزیں جائز اور مشروع ہیں جس کے دلائل میں فرمانِ نبوی، خلفاے راشدین کا عمل اور اجماعِ صحابہ کا تذکرہ اوپر ہوا ہے۔ اس سلسلے میں واضح دلیل یہ حدیث بھی ہے جو سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ:

مَا غِرْتُ عَلَى أَحَدٍ مِنْ نِسَاءِ النَّبِيِّ ﷺ مَا غِرْتُ عَلَى خَدِيجَةَ وَمَا رَأَيْتُهَا وَلَكِنْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُكْثِرُ ذِكْرَهَا وَرُبَّمَا ذَبَحَ الشَّاةَ ثُمَّ يُقَطِّعُهَا أَعْضَاءً ثُمَّ يَبْعَثُهَا فِي صَدَائِقِ خَدِيجَةَ فَرُبَّمَا قُلْتُ لَهُ كَأَنَّهُ لَمْ يَكُنْ فِي الدُّنْيَا امْرَأَةٌ إِلَّا خَدِيجَةُ فَيَقُولُ: "إِنَّهَا كَانَتْ وَكَانَتْ وَكَانَ لِي مِنْهَا وَلَدٌ۔"[1]

---

[1] صحیح البخاری: کتابُ مَنَاقِبِ الانصار (بابُ تزویجِ النَّبیِّ ﷺ خَدِیجَۃَ وَفَضْلِہا)، رقم 3818

''میں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی بیوی پر اتنی غیرت نہیں کی جس قدر سیدہ خدیجہؓ پر کی، حالانکہ میں نے ان کو دیکھا تک نہیں۔ مگر وجہ یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا بکثرت ذکر کرتے رہتے تھے۔ اور جب آپ کوئی بکری ذبح کرتے تو اس کے ٹکڑے کاٹ کر سیدہ خدیجہؓ کی سہیلیوں کو بھیجتے تھے۔ جب کبھی میں آپ سے کہتی کہ گویا دنیا میں کوئی عورت خدیجہؓ کے سوا تھی ہی نہیں تو آپ فرماتے: ''وہ ایسی تھیں اور ایسی تھیں اور میری اولاد بھی انہی کے بطن سے ہوئی ہے۔''

''ایسی تھیں اور ایسی تھیں'' سے مراد ام المؤمنین سیدہ خدیجہؓ کے عظیم فضائل ومناقب کا مسلسل تذکرہ ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلقہ اور بیوہ عورت کے احکام میں فرق ہے، اسی بنا پر وفات پا جانے والے زوجین کے لئے ایک دوسرے کو بوقتِ ضرورت غسل دینا بھی جائز ہے۔ اور اس کی دلیل قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ بھی ہے کہ جنت میں نیک میاں بیوی کو ایک دوسرے سے ملا دیا جائے گا، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ اور واضح ہے کہ یہ وعدہ طلاق یا خلع کے ذریعے جدا ہونے والے زوجین کے بارے میں نہیں۔

جہاں تک ہمارے پیش نظر مسئلہ کا تعلق ہے تو اس میں بنیادی نکتہ یہی ہے کہ وفات کے بعد، زوجین میں رشتہ ازدواج ختم ہوجاتا ہے اور انہی اُمور تک محدود ہوجاتا ہے جہاں تک شرعِ اسلامی میں اس کی صراحت رگنجائش موجود ہے اور ان جائز صورتوں میں یہ بھی شامل ہے کہ زندہ حالت میں داخل کیا ہوا شوہر کا جرثومہ، جنین کے وضع ہونے تک بیوہ کے رحم میں رہ سکتا ہے۔ اپنے فوت شدہ خاوند کا جرثومہ، اب بیوہ کے لئے اپنے رحم میں رکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ وفات کی بنا پر نکاح ختم ہوجانے کے بعد یہ شوہر کے جرثومہ کے لئے اب ناجائز محل ہے۔ کیونکہ اگر وہ اب بھی فوت شدہ کی بیوی ہوتی تو اس بیوہ کے لئے نفقہ اور سکنی بھی ہوتا یا اس کے لئے آگے نکاح کی حرمت ہوتی، جس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

علاوہ ازیں وفات کے بعد زوجین میں باقی رہ جانے والے امور میں: نظر وغسل، ایک دوسرے کی اچھی یادیں اور محبت کے تذکرے، آخرت میں اُنہیں اکٹھا کردیا جانا وغیرہ شامل ہیں۔

بعض شبہات کی وضاحت

شبہ نمبر 1: اس سلسلہ میں شبہ کہ یہ فرمان نبوی تو ماء یعنی جرثومہ کو محل غیر میں رکھنے پر ہے جبکہ زیر بحث مسئلہ اس سے اگلے مرحلہ 'نطفہ' کے بارے میں ہے تو واضح رہے کہ تخلیق انسان کے امکان، مراحل اور نسب میں اختلاط کے مشترک احکام کی بنا پر دونوں مرحلوں: (ماء اور نطفہ کے بارے میں) میں کوئی فرق نہیں ہے۔

شبہ نمبر 2: اور یہ شبہ کہ فوت شدہ شوہر کے نطفہ کو ضائع کرنا، ایک انسان کو قتل کرنے کے مترادف ہے، بھی کوئی وزن نہیں رکھتا کیونکہ نطفہ ہونے کے ناطے وہ انسان بننے کی صلاحیت تو رکھتا ہے، اسی لئے اس پر شرعی احکام لاگو ہور ہے ہیں لیکن وہ بہرحال ایک زندہ انسان نہیں ہے جس کو قتل کرنا حرام ہو۔ اس کی مزید وضاحت صحابہ کرامؓ کے اس فیصلے سے ہوتی ہے جو عبید اللہ بن رفاعہ سے مروی ہے کہ:

''سیدنا عمرؓ بن خطاب کے پاس بعض صحابہ کرامؓ نے عزل کا تذکرہ کیا اور اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں ان میں اختلاف ہوگیا تو عمرؓ بن خطاب فرمانے لگے: تمہارا اس بارے میں اختلاف ہوگیا ہے، حالانکہ تم بہترین بدری صحابہ ہو تو عام لوگوں کا کیا ہوگا؟ اس پر دو شخص سرگوشیاں کرنے لگے تو آپ نے پوچھا کہ کس بارے میں سرگوشیاں ہورہی ہیں؟ جواب ملا کہ یہود عزل کو 'چھوٹے زندہ گاڑنا' کے مترادف سمجھتے ہیں۔ اس پر سیدنا علیؓ بن ابو طالب نے فرمایا:

"إنها لا تكون موؤدة حتى تمرّ بالقارات السبع: تكون سلالة من طين ثم تكون نطفة ثم تكون علقة ثم تكون مضغة ثم تكون عظامًا ثم تكون لحمًا ثم تكون خلقًا آخر فعجب عمر من قوله وقال: جزاك الله خيرًا. [1]

''عزل کیونکر موءودۃ (زندہ گاڑنا) ہوسکتا ہے حتیٰ کہ وہ سات مراحل سے نہ گزرلے: کھنکتی مٹی... نطفہ... علقہ... مضغہ... پھر ہڈی... پھر گوشت... پھر روح۔ سیدنا عمرؓ اس قول

---

[1] نخب الافکار فی تنقیح مبانی الاخبار از امام بدرالدین عینی (858ھ): 10/ 393، اسنادہ صحیح اور تخریج مشکل الآثار از شعیب ارناؤوط، 5/ 174، سندہ حسن

سے بڑے خوش ہوئے اور اُنہوں نے سیدنا علیؓ کو جزائے خیر کی دعا دی۔''

یہی موقف مفسر قرآن سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ نے مراحل تخلیق پر سورۃ المومنون کی آیت:12 کی تفسیر میں بیان کیا ہے جس کی سند صحیح ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرارِ حمل کے بعد 120 ویں دن جنین میں فرشتے کی طرف سے روح پھونکے جانے کے بعد ہی قتل نفس کا حقیقی اعتبار ہوگا۔ اس سے پہلے، نطفہ کے مرحلے میں اس کا ضیاع 'مکروہ تنزیہی' سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور یہی موقف ممتاز اہل حدیث اور حنفی علماے کرام کا ہے جس کی مزید تفصیل راقم کی کتاب 'اسقاطِ حمل کے شرعی احکام' میں بادلائل ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

شبہ نمبر 3: زوجین کے لئے وفات کے بعد شرعی احکام میں تبدیلی کا تعلق، اُمورِ دنیا کے حوالے سے ہے۔تاہم رب کریم نے مسلمانوں پر مہربانی کرتے ہوئے، نیک مسلمانوں، ان کی اولادوں اور زوجین کو جنت میں ملانے کا وعدہ کیا ہے، شیخ محمد صالح عثیمین (م 1421ھ) لکھتے ہیں کہ:

"إذا مات رجل وزوجته وكانا من أهل الجنة فإنها تبقى زوجةً له، قال الله تعالى: ﴿رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدْتَهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾. وقال تعالى: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ﴾. والذرية شاملة لذرية الزوج والزوجة، فإذا كان الله يلحق بالمؤمنين ذرياتهم، فمعنى ذلك أن الزوج والزوجة يكونان سواءً، ويلحق الله بهما ذريتهما، وهذا من كمال النعيم الذي في الجنة، فإنها فيها ما لا عينٌ رأت، ولا أذنٌ سمعت، ولا خطر على قلب بشر"[1]

''جب مسلمان اور اس کی بیوی فوت ہوجائیں اور دونوں جنتی ہوں تو وہ جنت میں بھی اس کی بیوی ہی رہے گی، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد باری ہے کہ" باری تعالیٰ! ان کو ہمیشہ کے باغات میں داخل فرما جن کا تو نے وعدہ فرمایا ہے۔اور ان کے والدین، ازواج اور اولاد میں

[1] فتاویٰ نور علی الدرب از شیخ محمد بن صالح عثیمین: ج4/ص2

جو نیکوکار ہیں، بلاشبہ تو غالب حکمت والا ہے۔" اور رب کریم نے فرمایا کہ " جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان لانے میں ان کی پیروی کی، تو ان کی اولاد کو بھی ہم ان سے ملا دیں گے، اور ہم ان کے اعمال میں سے کچھ نہ کم کریں گے، ہر شخص نے جو کیا، وہ اس کو مل کر رہے گا۔" اولاد میں شوہر اور بیوی کی اولاد بھی شامل ہوتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ مؤمنوں سے ان کی اولاد کو ملا دیں گے، تو اس کا مطلب ہوا کہ شوہر بیوی دونوں اکٹھے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان دونوں سے ان کی اولاد کو ملا دیں گے۔ اور جنت کی کمال نعمتوں میں سے ہے، بلاشبہ اس میں وہ ملے گا جو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں، کسی کان نے سنا نہیں اور کسی انسان کے دل میں ان کا گمان تک نہیں گزرا۔"

تو یہ ان بیویوں کا تذکرہ ہے جو وہ دنیا میں سب سے آخری صالح شوہر سے نکاح کریں کہ ان کو ایسے زوجین کو جنت میں آپس میں ملا دیا جائے گا۔ اور یہ جنت کے انعامات ہیں جن کا دنیا میں شوہر کی وفات کے بعد، بیوی کے احکام جاری رہنے سے بہر حال کوئی تعلق نہیں۔ واللہ اعلم

شبہ نمبر 4: موت کے بعد ازدواجی حقوق وفرائض ختم ہو جاتے ہیں، اور ان میں سے وہی باقی رہ جاتے ہیں جن کا تذکرہ اوپر قرآن وسنت کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ ان اہم ازدواجی احکام میں بیوی کے لئے نفقہ (روٹی، کپڑا اور مکان وغیرہ) بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اور شوہر کی طرف سے بیوی کو وراثت میں حصہ ملنا، احکام وراثت کا تقاضا ہے اور اس کا بیوی کے نفقہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اور وراثت میں یہ حصہ تو شوہر کو بھی بیوی کی طرف سے ملتا ہے جس بیوی پر شوہر کا کوئی نفقہ واجب نہیں ہوتا۔

اسی طرح شوہر کی وفات کے بعد، اس کے گھر میں رہنے کی پابندی یا دوسرا نکاح کرنے کی ممانعت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اور کوئی شوہر اپنی بیوی پر بعد از وفات ایسی کوئی پابندی عائد کرے کہ وہ اس کے بعد آگے نکاح نہیں کر سکتی تو خلافِ شرع ہونے کی بنا پر اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ جیسا کہ سیدنا جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ۔

أن النبيَّ ﷺ خطَبَ أمَّ مُبَشِّرٍ بنتَ البراءِ بنِ مَعْرُورٍ، فقالت: إني شرطْتُ لزوجي أن لا أتزوجَ بعدَه. فقال النبيُّ ﷺ: أن هذا لا يَصلُحُ. [1]

[1] مجمع الزوائد از الہیثمی: 258/4، فتح الباری از ابن حجر: 9/126، نیل الاوطار از شوکانی: 282/6 سنادہ حسن

''نبی کریم ﷺ نے اُمّ مبشر بنتِ براء بن معرور کو نکاح کا پیغام بھیجا تو اُنہوں نے کہا کہ میں نے اپنے شوہر سے عہد کیا تھا کہ میں اس کے بعد نکاح نہیں کروں گی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ شرط/عہد درست نہیں ہے۔''

ان امور سے علم ہوتا ہے کہ زوجین میں سے کسی کی وفات کے بعد، ازدواجی تعلقات ختم ہوجاتے ہیں۔اور اُنہیں باقی رکھنے کی بعض صورتیں/شرائط طے بھی کرلی جائیں تو ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

اس کی تصدیق مزید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ کسی مسلمان کی وفات کے بعد، اس کی وراثت تقسیم کردی جاتی ہے۔ تقسیم وراثت کے وقت اس اولاد کو تو وراثت میں حصے دیے جاتے ہیں جو زندہ ہوں یا رحم مادر میں بصورت جنین ہوں، لیکن جو نطفہ کی صورت میں ہوں، اور زوجین میں سے کسی ایک کی وفات کے 2 یا 3 سال بعد پیدا ہوں تو ان کے وراثت میں کوئی حقوق نہیں ہوں گے۔

معاہدہ کی پاسداری

اس موقف کو یہ امر مزید تقویت دیتا ہے کہ جب زوجین نے مصنوعی بارآوری کے لئے اپنے جرثومہ اور بیضہ کا ملاپ کرتے وقت تحریری معاہدہ کیا تھا، جیسا کہ سوال میں مذکور ہے کہ

''طے پایا کہ طلاق، قانونی جدائی، اور کسی ایک فریق یا دونوں کی وفات کی صورت میں تولیدی جرثومے ضائع کردیے جائیں گے اور میاں بیوی میں سے کوئی اسے استعمال نہیں کرسکے گا۔''

جب وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل نے پاکستان میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی اجازت دی تو اس کے ساتھ بعض شرائط کو لازمی قرار دیا اور علمائے کرام کی راہنمائی سے ہی غالباً ہسپتال انتظامیہ نے یہ شرائطِ معاہدہ تشکیل دیں اور ان پر زوجین سے دستخط کرائے ہیں۔ چنانچہ زوجین کا یہ معاہدہ شرعی تعلیمات کی پاسداری کرتے ہوئے ان کی مزید توثیق کرتا ہے، جیسا کہ فرمانِ نبوی ہے کہ: (بقیہ صفحہ نمبر ۳۳)

فقہ وقانون

اُردو ترجمہ: مدیر

یورپین ہائی کورٹ برائے انسانی حقوق نے ترکی کی رفاہ پارٹی پر پابندی کو جائز قرار دے دیا

شریعت سیکولرزم، جمہوریت اور بنیادی حقوق کی مخالف ہے

ترکی کی آئینی عدالت کے رفاہ پارٹی پر پابندی سے آزادیٔ اجتماع کے حق کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔کورٹ کا متفقہ فیصلہ مؤرخہ ۱۳ فروری ۲۰۰۳ء

حقائق

درخواست گزار اوّل (رفاہ پارٹی) ایک سیاسی جماعت ہے جبکہ درخواست گزار دوم [نجم الدین اربکان] اس کے صدر اور درخواست گزار سوم دونوں اس کے وائس چیئرمین ہیں اور جس وقت پارٹی پر پابندی لگی اس وقت یہ سب پارلیمنٹ کے رکن تھے۔ رفاہ پارٹی نے ۱۹۹۱ء کے انتخابات میں 16.88 فیصد ووٹ حاصل کیے اور ۱۹۹۵ء کے انتخابات میں وہ 22 فیصد ووٹ حاصل کرکے پارلیمنٹ میں اکثریتی پارٹی کے طور پر سامنے آئی۔ بعد میں اس نے ٹروپاتھ پارٹی سے مل کر مخلوط حکومت بنائی۔ مئی ۱۹۹۷ء میں سپریم کورٹ کے اٹارنی جنرل نے آئینی عدالت میں درخواست دی کہ رفاہ پارٹی کو خلافِ قانون قرار دیا جائے کیونکہ یہ آئین کے سیکولر کردار (بمطابق دفعہ 69) کی خلاف ورزی کررہی ہے اور اس نے پارٹی کی قیادت اور ارکان کے بیانات اور سرگرمیوں کی تفصیل عدالت میں پیش کی۔ پارٹی نے عدالت میں مؤقف اختیار کیا کہ قائدین کے بیانات کو توڑ موڑ کر اور سیاق وسباق سے ہٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ کسی نے قانون کی خلاف ورزی نہیں کی اور پارٹی کو وارننگ بھی نہیں دی گئی کہ وہ کسی متعلقہ قصوروار کو سزا دیتی۔ اٹارنی جنرل نے کہا کہ پارٹی اپنی سرگرمیوں کو جہاد (یعنی مقدس جنگ) سے تعبیر کرتی رہی ہے۔ اس نے ملک کو اسلامی ریاست بنانے اور شریعت نافذ کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ پارٹی صدر نے ریاست کو قوت استعمال کرتے ہوئے اسلامی بنانے اور شریعت نافذ کرنے کا واضح اعلان کیا جو سیکولرزم کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے۔ عدالت نے پارٹی کے دوسرے ارکان خصوصاً ارکان پارلیمنٹ کے بیانات کا بھی ذکر کیا

جنہوں نے نفاذ شریعت اور اس کے لیے تشدد کے استعمال کی حمایت کی تھی۔ پارٹی پر پابندی کے نتیجے میں پارٹی کے اثاثہ جات خود بخود بحق سرکار ضبط کر لیے گئے۔ نیز آئینی عدالت نے درخواست گزاروں کی پارلیمنٹ کی رکنیت بھی ختم کردی اور ان پر اگلے پانچ سال تک نئی جماعت نہ بنانے کی پابندی بھی لگا دی۔

قانون (آرٹیکل ۱۱)

بظاہر رفاہ پارٹی پر پابندی حقِ آزادیٔ اجتماع کے خلاف محسوس ہوتی ہے لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ پارٹی ایک جمہوری سیکولر ریاست کے آدرشوں کے خلاف کام کر رہی تھی تو ظاہر ہے آئینی عدالت کے فیصلے کو متنازعہ نہیں کہا جا سکتا۔ بظاہر سیاسی جماعتوں کے قانون اور آئین میں اختلاف محسوس ہوتا ہے لیکن ایسی صورت میں چونکہ آئین کو قوانین پر بالادستی حاصل ہوتی ہے لہٰذا آئینی عدالت حق بجانب تھی کہ اس نے آئین کو متذکرہ قانون پر فوقیت دی۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ رفاہ ایک بڑی سیاسی جماعت تھی جس کے پاس ایسے قانونی مشیر موجود تھے جو آئینی اور قانونی پیچیدگیوں کو سمجھتے تھے۔ دیگر درخواست گزار پرانے سیاستدان تھے اور ان میں سے دو تو خود وکیل تھے۔ ان حالات میں درخواست دہندگان سمجھ سکتے تھے کہ اگر پارٹی نے سیکولرزم کی خلاف ورزی کی تو اس پر پابندی لگ سکتی تھی۔ پھر ترک جمہوریہ میں سیکولرزم کو جو اہمیت حاصل ہے، اس میں رفاہ پر پابندی لگانے کا مقصد نیشنل سیکورٹی، پبلک سیفٹی اور دوسرے لوگوں کے حقوق اور آزادیوں کا تحفظ بھی ریاست کے پیش نظر تھا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ عدالت کی مداخلت کیوں ضروری تھی تو عدالت کو تین چیزیں مدنظر رکھنا تھیں۔ ایک یہ کہ کیا ایسے خاطر خواہ ثبوت موجود تھے جن سے یہ سمجھا جائے کہ جمہوریت خطرے میں ہے؟ کیا قائدین وارکانِ جماعت کے بیانات پارٹی کی مجموعی پالیسی کی ترجمانی کرتے تھے؟ کیا جماعت بحیثیت تنظیم اپنے بیانات واعمال کے ذریعے ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتی تھی جو 'جمہوری معاشرے' کی ضد تھا؟

(a) شدید سماجی ضرورت (Pressing Social Need)

جس وقت پارٹی پر پابندی لگی اس وقت الیکشن کے نتیجے میں پارٹی مخلوط حکومت کی

مجبوری کے باوجود اس قابل تھی کہ اقتدار پر قابض ہوجاتی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بیانات کئی سال پہلے کے تھے لیکن ان بیانات کے بعد پارٹی جن خطوط پر آگے بڑھتی رہی تھی، عدالت انہیں سامنے رکھ کر اندازہ لگا سکتی تھی کہ کیا جمہوریت واقعی خطرے میں تھی۔ اگر کسی پارٹی کو طویل عرصہ کام کرنے کا موقع ملے تو اس کے پروگرام اور پالیسیاں واضح ہوجاتی ہیں اور اسے اپنے منشور کے مطابق اقتدار ملنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ رفاہ کی پالیسیاں بنیادی حقوق اور آزادیوں کے روایتی (Conventional) قانونی ڈھانچے کے خلاف تھیں ہی لیکن اس کے اقتدار حاصل کرنے کے امکانات نے اس خطرے کو ٹھوس اور واضح شکل دے دی تھی اور عدالت پر یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے پہلے کیوں نہ ایکشن لیا یا ابھی کیوں لیا؟ اگرچہ پارٹی کے قائدین اور ارکان کے بیانات کے باوجود پارٹی نے آئین کو غیر جمہوری طریقوں سے تبدیل کرنے کا اعلان نہ تو کبھی اپنے آئین میں کیا اور نہ کبھی مخلوط حکومت کے پروگرام میں۔ پارٹی کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے صرف قائدین کے بیانات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ تینوں درخواست گزاروں کے بیانات کو بلاشبہ پارٹی مؤقف ہی سمجھا جائے گا کیونکہ پارٹی کے عہدیدار ہونے کی حیثیت سے ان کے بیانات ہی پارٹی پالیسی متصور ہوں گے الا یہ کہ انہوں نے اس کے برعکس اعلان کیا ہو۔ مرکزی قائدین کے علاوہ دوسرے منتخب عہدیداران کے بیانات بھی، جن میں وہ پارٹی کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہیں، واضح کرتے ہیں کہ وہ کیسا معاشرہ تشکیل دینا چاہتے ہیں، انہیں پارٹی پالیسی ہی سمجھا جائے گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ پارٹی نے ان عہدیداروں کے خلاف ان کے بیانات کی وجہ سے کبھی کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی۔

جہاں تک پارٹی کو غیر قانونی قرار دینے کا تعلق ہے تو اس کے تین بڑے سبب ہوسکتے ہیں۔

i۔ معاشرے میں دو قانونی نظاموں کی بیک وقت موجودگی کنونشنل سسٹم کی طرح نہیں ہوتی کیونکہ اس سے عوام کے درمیان مذہبی بنیادوں پر تفریق وجود میں آتی ہے اور ریاست کا یہ کردار ختم ہوجاتا ہے کہ وہ انفرادی حقوق اور آزادیوں کی ضامن ہوتی ہے اور مختلف عقائد اور مذاہب سے وابستگی رکھنے والوں کے لیے غیر جانبدار انتظامیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ نیز اس سے انسانوں کے درمیان امتیازی سلوک کی راہیں کھلتی ہیں۔

ii۔ جہاں تک ترکی میں ایک سے زیادہ قانونی نظاموں کی موجودگی میں نفاذ شریعت کا تعلق ہے، جس کا واضح مطالبہ رفاہ کی قیادت کرتی رہی ہے، یہ عدالت ترکی کی آئینی عدالت کے اس فیصلے کو حق بجانب سمجھتی ہے کہ اس سے رفاہ کا مقصد معاشرے اور ریاست کو مذہبی قوانین کے مطابق چلانا تھا جبکہ شریعت میں جمہوریت کے بنیادی اصولوں اور عوامی آزادیوں کی کوئی گنجائش نہیں اور شرعی حکومت کنونشنل قانونی ڈھانچے کی اقدار سے لازماً انحراف کرتی ہے لہٰذا معاہدے میں شریک ریاستیں اپنے تاریخی تجربے کی روشنی میں ایسی سیاسی تحریکوں کی مخالفت کرسکتی ہیں جو مذہبی بنیاد پرستی پر مبنی ہوں لہٰذا ترکی کی آئینی عدالت آئین میں سیکولرزم کے اصولوں کی موجودگی کی وجہ سے یہ قرار دے سکتی تھی کہ شریعت جمہوریت کے مطابق نہیں ہے۔

iii۔ جہاں تک شریعت اور ملک میں ایک سے زیادہ قانونی نظاموں کی موجودگی کا تعلق ہے تو رفاہ کی پالیسی یہ تھی کہ مسلم آبادی پر شریعت کے بعض پرائیویٹ لاز (عائلی قوانین) کا اطلاق کیا جائے لیکن یہ پالیسی ترکی کے آئینی ڈھانچے کے خلاف تھی جس میں ہر فرد اپنے ضمیر کے مطابق مذہب پر عمل کرتا ہے لہٰذا پرائیویٹ لاز کا نفاذ اور اپنی مرضی سے مذہب پر عمل کرنے کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا واضح ہے کیونکہ پرائیویٹ لاز کے نفاذ کا مطلب ہے معاشرے کی تنظیم وتشکیل پر اثر انداز ہونا جبکہ ترکی کا آئینی ڈھانچہ فرد کو اپنے ضمیر کے مطابق مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دیتا ہے لہٰذا ریاست کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دائرۂ عمل میں اس طرح کے مذہب پر مبنی پرائیویٹ لاز کی تنفیذ کو روک دے جو جمہوری اقدار اور پبلک آرڈر کے خلاف ہوں۔

iv۔ جہاں تک قوت کے استعمال کا تعلق ہے تو 'جہاد' کا جو مفہوم بھی لیا جائے بہر حال یہ ایک مبہم اصطلاح ہے اور سیاسی قوت کے حصول کے لیے استعمال کی گئی ہے اور آئینی عدالت نے رفاہ کے لوگوں کی جو تقریریں ثبوت میں پیش کی ہیں ان میں قوت کے استعمال کو قانونی جواز دے کر پیش کیا گیا ہے۔ پھر رفاہ نے ان ارکان سے لاتعلقی کا بھی کبھی اعلان نہیں کیا جو قوت کے استعمال کی بات کرتے رہے ہیں۔(بقیہ صفحہ نمبر ٦٦)

اسلام اور پاکستان　　رانا شمس الرحمٰن

پاکستان میں شریعت کبھی نافذ نہیں ہو سکتی
کیا اس کی بڑی وجہ علماءِ سُو ہیں؟

ہم اپنے دوست شاہد صاحب کو ملنے گئے تو ان کے ہاں محلے کے کچھ لوگ بیٹھے تھے، چائے کا دور چل رہا تھا اور سیاست پر بحث ہو رہی تھی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب، جن کا نام بعد میں امجد معلوم ہوا، بڑھ چڑھ کر علماء کے خلاف بول رہے تھے خصوصاً مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور علامہ ساجد میر صاحب کے خلاف۔ وہ کہنے لگے اب کوئی بتائے کہ یہ مولوی کس خوشی میں چوروں اور ڈاکوؤں کے حمایتی بنے ہوئے ہیں؟ کیا اس میں بھی دین کا کچھ فائدہ ہے؟ ایک اور موقع پر انہوں نے کہا کہ دین کو نقصان کسی اور نے اتنا نہیں پہنچایا جتنا ان مفاد پرست، فرقے باز مولویوں نے پہنچایا ہے۔ ہم کچھ دیر تو ان کی ہفوات سنتے رہے اور جب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو ہم نے انہیں کہا کہ آپ کو بعض علماء کی رائے سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن آپ کو ان کی اس طرح مخالفت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ بہر حال وہ دین کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس سے علماء کا نہیں دین کا نقصان ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا، معاف کیجیے گا، دین کو اتنا نقصان بے دینوں نے نہیں پہنچایا جتنا ان مولویوں نے پہنچایا ہے۔ پاکستان میں اگر شریعت نافذ نہیں ہوسکی تو اس کی بڑی وجہ یہی فرقے باز علماءِ سُو ہیں جو جوڑ توڑ کر کے ہر حکمران سے مل جاتے ہیں اور اقتدار کے مزے لوٹتے ہیں۔ وہ دینی عناصر کو متحد نہیں ہونے دیتے کیونکہ نفاذ شریعت ان کی ترجیح ہی نہیں۔

ہم نے کہا دیکھیے! آپ کو ان کی نیت پر حملہ نہیں کرنا چاہیے۔ مولانا فضل الرحمٰن اگر اقتدار میں ہوتے ہیں تو اس کے کچھ دینی فوائد بھی ہیں مثلاً وہ دینی مدارس کی حفاظت کرتے ہیں جنہیں ہمارے حکمران اہل مغرب کی خواہش پر ختم کرنا اور غیر مؤثر بنانا چاہتے ہیں۔ امجد صاحب کہنے لگے: یہ ایک اور فراڈ ہے۔ مولانا صاحب اپنے مسلک کے مدارس کو قابو میں

رکھنے اور انہیں سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے انہیں یہ تاثر بار بار دیتے ہیں کہ میں تمہارا سرپرست ہوں اور تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دینی مدارس کے مسائل جوں کے توں ہیں اور حکومت دینی مدارس سے بالکل تعاون نہیں کررہی اور ان کے مسائل کو ختم کرنے میں مولانا کوئی کردار ادا نہیں کررہے۔

ہم نے کہا اگر آپ کے مؤقف کو صحیح سمجھا جائے تو ملک بھر کے علماء کیا بیوقوف ہیں جو مولانا فضل الرحمٰن کی حمایت کرتے ہیں؟ وہ کہنے لگے ان کی حمایت صرف ان کے مسلک کے علماء کرتے ہیں، دوسرے نہیں۔ اور اس حمایت کی وجہ یہ نہیں کہ مولانا حق پر ہیں بلکہ اس کی وجہ مسلک پرستی ہے۔ اس ملک میں مسلک پرستی کا راج ہے اور یہی فرقہ واریت کی جڑ ہے جو اپنی اصل میں غیر اسلامی ہے اور خلافِ قرآن وسنت ہے۔

ہم نے کہا امجد صاحب! آپ خواہ مخواہ علماء کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ پاکستان میں شریعت نافذ نہ کرنے کے اصل ذمہ دار تو ہمارے سیکولر و لبرل حکمران ہیں جو مغرب زدہ ہیں اور امریکہ ویورپ کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ امجد صاحب کہنے لگے: سیاستدانوں اور حکمرانوں سے توقع تو ہمیں تھی، نہ ہے۔ جن سے توقع تھی یعنی علماء سے، دیکھنا یہ ہے کہ ان کا رویہ کیا ہے؟ ان میں اگر عقل ہوتی، اگر اخلاص ہوتا تو یہ سب متحد ہو جاتے کیونکہ متحد ہونے ہی میں ان کی کامیابی تھی لیکن ان میں سے ہر مسلک کے عالم اور لیڈر نے اپنے مسلک کی مسجد، اپنے مسلک کا مدرسہ، اپنے مسلک کی دینی سیاسی جماعت بنالی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی قوت تقسیم ہوگئی اور اس فرقہ واریت نے عوام کو بھی تقسیم کر دیا، ان کا ووٹ بنک بھی تقسیم ہو گیا اور وہ ناکام ہو گئے۔ لہٰذا مغرب اور مغرب کے ایجنٹ حکمرانوں کے مقاصد تو یہ علماء اپنی نادانی سے خود پورے کررہے ہیں اور اگر پاکستان میں دین غالب نہیں ہوا تو اس کی بڑی وجہ یہ علماء سو ہیں۔

اسلام اور مغرب　　　　پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

اسلام، مغربی تہذیب اور قومی ریاست

ترجمان القرآن میں ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی صاحب کے مضمون 'موجودہ دنیا کی تین عالمگیر تہذیبیں' پر ایک نظر

* مئی ۲۰۲۳ء کے ترجمان القرآن میں ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی صاحب کا مذکورہ موضوع پر مضمون شائع ہوا ہے جو بہت عمدہ، معلوماتی اور دلچسپ ہے اور ہمارے قارئین میں سے جنہوں نے ابھی تک یہ مضمون نہیں دیکھا ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ یہ مضمون ضرور پڑھیں۔

* ڈاکٹر صاحب بہت منجھے ہوئے محقق ہیں۔ فکری طور پر تحریک اسلامی سے متعلق ہیں۔ راقم چونکہ لوگوں سے ملنے جلنے میں کمزور ہے لہٰذا ان سے میری اکلوتی ملاقات مرحوم ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کے گھر اس طویل فکری نشست میں ہوئی تھی جو مرحوم نے راقم کے کہنے پر اپنے ہاں منعقد کی تھی جس میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ڈاکٹر ایس ایم زمان (جو اس وقت بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے نائب صدر تھے)، ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی صاحب (جو اس وقت یونیورسٹی میں ڈین سوشل سائنسز تھے) اور ڈاکٹر محمد الغزالی موجود تھے جبکہ لاہور سے جناب احمد جاوید صاحب اور پروفیسر ملک محمد حسین مرحوم میرے ساتھ آئے تھے۔

* تو خیر، ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ اس تحریر سے مقصود ڈاکٹر صاحب کا معارضہ اور ان پر تنقید نہیں بلکہ مقصود تبادلۂ خیال اور خرد افروزی ہے۔ ہم ان کے بعض نکات کا خلاصہ قارئین کے سامنے رکھیں گے اور بعض تنقیح طلب امور کا ذکر کریں گے۔

* ایک اور عمومی بات تحقیق میں معروضیت کے حوالے سے۔ ہمارے ہاں اکثر تحقیق کرنے والے یہ سمجھتے ہیں (غالباً مغرب میں تحقیق کے اصولوں سے متاثر ہو کر) کہ معروضیت کا تقاضا یہ ہے کہ حقائق بیان کر دیئے جائیں اور ان پر کوئی حکم نہ لگایا جائے کہ کون غلط ہے اور کون صحیح ؟ یا کون اچھا ہے اور کون برا؟ جیسے ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس مضمون میں مسیحی ،

اسلامی اور مغربی تہذیب کا ذکر کیا ہے اور ان کے بارے میں کافی اعداد و شمار پیش کیے ہیں لیکن وہ یہ بالکل نہیں کہتے کہ مغربی تہذیب خلافِ اسلام ہے یا اسلامی تہذیب دوسری تہذیبوں سے بہتر ہے یا مسلمانوں کو مغربی تہذیب کو اس کے الحاد اور بے دینی کی وجہ سے ردّ کر دینا چاہیے وغیرہ۔ شاید وہ اسے معروضیت کے قاعدے کے خلاف سمجھتے ہیں۔

راقم کو تحقیق کا طالب علم ہونے کے ناطے کبھی بھی معروضیت کے اس تصور پر اطمینان نہیں ہوا خصوصاً اسلامی تعلیمات ، اقدار، تصورات اور اداروں کے دوسرے ادیان اور تہذیبوں سے تقابلی مطالعے میں۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک مسلمان محقق کو چاہیے کہ وہ تقابلی مطالعہ کرے، حقائق بتائے، مشترکات اور اختلافات کا ذکر بھی کرے لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتائے کہ دوسرا نقطۂ نظر اسلام کے مطابق ہے یا اس سے متضاد؟ مسلمانوں کے لیے مفید ہے یا مضر؟ کن نقلی و عقلی دلائل کی بنیاد پر اسلامی نقطۂ نظر مخالف نقطۂ نظر سے بہتر اور برتر ہے اور مسلمانوں کو کس نقطۂ نظر کو قبول کرنا چاہیے اور کس کو رد کرنا چاہیے۔ ہمارے نزدیک یہ اس لیے ضروری ہے کہ مغرب کی الحادی اور بے دین تہذیب کے علمبردار ممالک نے مسلمانوں کو تقریباً دو صدیوں تک غلام بنائے رکھا اور آج بھی مسلم معاشرے کے اکثر طبقات (خصوصاً حکمران طبقات [جیسے سیدستدان، فوج، عدلیہ، بیوروکریسی وغیرہ] ، اساتذہ ، صحافی، ادیب، شاعر وغیرہ) مغرب کی فکری و عملی غلامی میں مبتلا ہیں اور انہیں اس غلامی سے نکالنا اسلامی ذہن رکھنے والے مسلم اہل علم و دانش کا فرض ہے۔

ان تمہیدی گزارشات کے بعد اب آیئے مذکورہ مضمون کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں سمجھ نہیں آئی کہ ڈاکٹر صاحب محترم نے کیوں کر مسیحی تہذیب کو دنیا کی سب سے بڑی تہذیب قرار دیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بنیادی بات یہ ہے کہ ان کے نزدیک 'تہذیب'(Civilization) کی تعریف کیا ہے؟ ہوسکتا ہے انہوں نے رواروی میں سیموئیل ہنٹنگٹن کی '*Clash of Civilizations*' سے متاثر ہو کر یہ رائے قائم کر لی ہو؛ حالانکہ ہنٹنگٹن کا نظریۂ تہذیب بذات خود بوگس ہے اور اس نے بھی 'تہذیب' کی واضح تعریف نہیں کی۔

ہماری رائے میں تہذیب کی بنیاد یہ ہے کہ کوئی قوم یا معاشرہ انسان کو درپیش تین بنیادی

ایشوز کا کیا جواب دیتا ہے یعنی ان کا تصورِ الٰہ، تصورِ انسان اور تصورِ کائنات کیا ہے؟ جسے آج کل ورلڈ ویو کہا جاتا ہے۔ اور ہر معاشرے کے نظام حیات کی بنیاد اس کا ورلڈ ویو ہوتا ہے۔ تہذیب گویا کسی معاشرے کے افکار و عقائد کے عملی زندگی میں اظہار کو کہتے ہیں۔ جیسے یہ افکار و عقائد ہوں گے ویسی ہی تہذیب وجود میں آئے گی۔ تصورِ الٰہ، تصورِ انسان اور تصورِ کائنات کے حوالے سے افکار و عقائد کے دو گروپ ہمیشہ سے ہمیں انسانی تاریخ میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جو ایک اللہ کو مانتا ہے اور اس کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارتا ہے اور دوسرا وہ جو نہ اللہ کو مانتا ہے اور نہ اس کی ہدایت کو؛ بلکہ زندگی اپنی مرضی، اپنی عقل اور اپنی خواہشات کے مطابق گزارتا ہے۔ اس فکری و عملی روش یا نظام افکار و نظامِ حیات کو قرآن 'دین' کہتا ہے اگر کسی تہذیب کے افکر و اعمال کی بنیاد الٰہی ہدایت ہوگی تو ہم اسے دینی، اسلامی یا مسلم تہذیب کہیں گے اور اگر اس کی بنیاد الٰہی ہدایت کی بجائے انسانی عقل و خرد ہو تو وہ الحادی، بے دینی پر مبنی اور غیر اسلامی تہذیب ہوگی۔ یا اسے ہم اس کے علاقے سے منسوب کرتے ہوئے مصری تہذیب یا یونانی تہذیب یا مغربی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔

اگر کوئی تہذیب الٰہی ہدایت کو جزوی طور پر تسلیم کرے تو اسے بھی ہم غیر اسلامی تہذیب کہیں گے کیونکہ اسلام کا جو مطلب ہمیں اللہ نے سمجھایا ہے وہ غیر مشروط اور لامحدود عبادت واطاعت کا ہے اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے بعض امور میں اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور بعض میں نہیں کرتا تو وہ 'مسلم' نہیں کہلائے گا اور نہ اس کے طرز حیات کو ہم 'اسلام' سے تعبیر کر سکیں گے۔ [اس وضاحت سے ہنٹنگٹن کی تھیوری کی بھی تغلیط ہوگئی کہ ہر تہذیب کی اصل دین ہوتا ہے (خواہ وہ منزّل من اللہ ہو یا لوگوں کا اپنا وضع کردہ) جبکہ وہ کہتا ہے کہ اصل چیز تہذیب ہوتی ہے اور مذہب (Religion) محض اس کی تکوین کا ایک جزو ہوتا ہے]۔

'تہذیب' کی نوعیت کے بارے میں اگر آپ اس وضاحت کو سامنے رکھیں تو ہم اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ مسیحیت نہ کوئی دین ہے اور نہ کوئی تہذیب، بلکہ یہ ایک محرف مذہب (Religion) ہے۔ ہمارے اس مؤقف کے دلائل یہ ہیں:

i۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صاحبِ کتاب نبی ضرور تھے لیکن وہ نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہ شریعت موسوی کے پیرو تھے۔ بعد میں یہود نے اپنے مذہب میں تحریف

کر دی۔ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو کتاب نازل ہوئی اس میں 'شریعت' موجود ہی نہ تھی۔ اور اگر تھوڑی بہت تھی بھی تو وہ سینٹ پال نے نکال دی اور اس وقت جو محرف شدہ اناجیل ہمارے پاس موجود ہیں وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں ان کے صحابیوں کی تحریریں ہیں نہ کہ وہ کتاب جو اللہ نے حضرت مسیح علیہ السلام پر اتاری تھی۔

ii۔ یہی وجہ ہے کہ جب روم کے بادشاہ کانسٹنٹائن نے مسیحیت قبول کی تو اسے نظام زندگی چلانے کے لیے یونانی فکر و تہذیب اور رومن روایات وقوانین سے کام لینا پڑا کیونکہ مسیحی لٹریچر میں اجتماعی زندگی اور اداروں (جیسے سیاسی نظام، معاشی نظام، قانونی نظام وغیرہ) سے متعلق ہدایات موجود ہی نہ تھیں۔

iii۔ قرون مظلمہ کے بعد جب اہل مغرب نے نشأۃ ثانیہ کی تحریک چلائی تو انہیں اس مذہب اور مذہبی طبقے کو رد کرنا پڑا جو بادشاہ اور جاگیرداروں کے ساتھ مل کر ان پر ظلم وستم کا ارتکاب کر رہا تھا اور متبادل کے طور پر اسے یونانی اور رومی فکر و عمل کو اپنانا پڑا۔ یوں ہیومنزم میں خدا پرستی کی بجائے جب انسان اور اس کی رائے کی تقدیس کا تصور ابھرا اور معاشرے میں فکری کشمکش بڑھی تو سیکولرزم کی صورت میں اس کا یہ حل سامنے آیا کہ جو شخص مسیحیت کو اپنی ذاتی زندگی میں ماننا چاہتا ہے، مان لے لیکن معاشرے، ریاست، اور اجتماعی اداروں کا سارا کاروبار انسانوں کی اپنی مرضی سے چلے گا جس کی بنیاد یونانی ورومن فکر و تہذیب ہوگی۔ یوں سولھویں صدی کے بعد ہیومنزم اور سیکولرزم اور بعد میں ریفارمیشن (Reformation) اور تحریک تنویر (Enlightenment) کی صورت میں جو نظامِ حیات ابھرا اس میں مسیحیت برائے نام تھی۔ لہٰذا مسیحی تہذیب نہ ماضی میں موجود تھی (رومن عہد میں) اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ تو مسیحی تہذیب کے بارے میں ڈاکٹر گیلانی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب Irrelevant ہے یا خلط مبحث ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیحیت ایک مذہب (Religion) ہے اور وہ بھی محرف، Distorted اور بگڑا ہوا۔ وہ نہ 'دین' ہے اور نہ تہذیب۔

۲۔ ڈاکٹر گیلانی صاحب نے اپنے مضمون میں ایک طرف مسیحی تہذیب کو بانس پر چڑھایا تو دوسری طرف مغربی تہذیب کو گھٹا کر پیش کیا جو ان کے نزدیک صرف ۱۵ فیصد ہے اور

اسے مسیحی اور اسلامی تہذیب کے بعد تیسرے درجے پر رکھا حالانکہ وہ اس وقت دنیا کی غالب تہذیب ہے اور وہ مسیحیت کے ساتھ اسلامی تہذیب بلکہ دنیا کی دوسری ساری تہذیبوں پر حاوی ہے۔خود ڈاکٹر صاحب کو اس کا احساس ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں:

i۔ ''الہامی ادیان یعنی عیسائیت اور اس کے ایک بے نام حریف کی پذیرائی اور قوت کے اداروں پر اس کی اجارہ داری نے قومی ریاست کی شناخت کی اوّلیت اور الحاد کے فلسفے کے مرکب سے جدید لادینی تہذیب کا نیا اضافہ کر دیا ہے۔عیسائیت اور اسلام دونوں بہت کثیر التعداد اور طاقت ور تہذیبیں ہونے کے باوجود دنیا کے نظامِ جبر (Coercive power) میں وہ حیثیت حاصل نہ کر سکی تھیں، جو اس نئی تہذیب نے حاصل کی ہے۔اس کی رکنیت کرۂ ارض کے تمام انسانوں کے لیے چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود لازمی قرار پائی ہے۔اس کے پیروکار بالعموم اس مذہبی فکر اور پہچان کو ثانوی حیثیت دے کر بیک وقت کسی اور مذہب کے پیروکار بھی ہو سکتے ہیں۔اس لیے یہ تہذیب مذاہب کے اس سلسلے میں شمار کی جائے گی، جن میں ایک سے زیادہ دیوتاؤں (Gods) کی اجازت ہے۔''[صفحہ: ۶۳]

ii۔ ''اس تیسری عالم گیر تہذیب نے تعلیمی نظام پر ایک مخفی یا نیم مخفی اجارہ داری قائم کر لی ہے۔اس کا تعلق نظام عدل کے ایک خاص عالم گیر نظام اور اطلاق سے ہے۔'عالم گیر انسانی حقوق' (Universal Human Rights) کی تعریف، حقوق سے زیادہ اُن اخلاقی معاملات سے منسلک ہوگئی ہے جو تاریخی طور پر عیسائیت اور اسلام یا دیگر بہت سے پیروکاروں والے مذاہب کے دائرۂ کار میں شامل تھے۔''[صفحہ: ۱۷]

iii۔ ''بعض لحاظ سے جدید لادینی تہذیب، معاصر دنیا کی سب سے زیادہ سرایت کی ہوئی اور دنیاوی لحاظ سے سب سے طاقت ور تہذیب ہے۔معاشی وسائل اور ریاستی و سیاسی جبر کے وسائل پر اس کی گرفت غیر معمولی ہے۔تعداد کے لحاظ سے اس کے براہِ راست پیروکار دنیا کی آبادی کا ۱۵ فیصد ہیں، لیکن معاش اور جبر کی قوت (Coercive power) کے لحاظ سے اس کا تناسب اپنی تعداد کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔''[صفحہ: ۷۸]

iv۔ ''عالم گیر لادینی تہذیب، اتباعِ فلسفہ کو اتباعِ الہام پر مقدم قرار دیتی ہے۔یہی

وہ تبدیلی ہے جسے یورپی مفکرین یونانی اور رومی علمی تہذیب کا احیا (Renaissance) بھی کہتے ہیں۔ دین کے بنیادی عقائد یا ارکان کے معاملے میں فلسفے کی اتباع کو الہام کے اتباع پر مقدم کرنے کے دروازے سے عیسائی تہذیب کا ایک چھوٹا حصہ تو برملا بے دین ہو گیا اور بقیہ میں ایک قابل ذکر حصہ دین کی بنیادوں پر شک وشبہے میں مبتلا ہو گیا۔ چنانچہ معاصر عیسائی تہذیب کے پیروکاروں کی ایک قابل ذکر تعداد خالق، آخرت، جزا وسزا اور روح کے بارے میں وہی تصورات رکھتی ہے جو عالم گیر لادینی تہذیب کی پہچان ہیں۔'' [صفحہ: ۸۲]

v۔ ''عالم گیر لادینی تہذیب نے اپنے ادارتی جبر (Institutional Coercion) سے بقیہ تمام تہذیبوں کو اپنے جائز مقام سے محروم کر دیا ہے۔ لادینیت کی تہذیب انتہائی قلیل التعداد یا غیر متعلقہ گروہی عناصر کی منفرد تہذیبی شناختوں کو اُجاگر کر کے اپنے علاوہ بقیہ پانچ بڑی تہذیبوں کو ان کے مقام سے محروم کرنے کی منظم کوشش کرتی رہتی ہے۔

'' موجودہ حالات میں جب تہذیبوں کے مکالمے کی بات ہوتی ہے تو عالم گیر لادینی تہذیب اپنے آپ کو انسانیت کا محور (Humanist) کہہ کر تمام دیگر تہذیبوں کو اپنے اخلاقی معیارات کو اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے اور قومی ریاستوں کے عالم گیر اداروں سے ان کی توثیق کروالیتی ہے۔ دراندازی کے اس دروازے سے عالم گیر لادینی تہذیب کا سماجی نفوذ اور سیاسی غلبہ دیگر بڑی تہذیبوں بالخصوص عیسائیت اور اسلام کے لیے بنیادی پیچیدگیاں پیدا کر رہا ہے۔ ہمارا مؤقف ہے کہ تمام انسانوں کے نام پر انسانیت کو ایک تہذیب کہنے سے لادینیت کی عالم گیر تہذیب کی اجارہ داری کا راستہ کھل جاتا ہے۔'' [صفحہ: ۸۲]

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ مغرب کے وہ لوگ جنہوں نے مسیحیت کو رسماً نہیں چھوڑا وہ بھی مغربی تہذیب اور اس کی آئیڈیالوجی کو قبول کیے ہوئے ہیں اور ان کی مسیحیت برائے نام ہے یا محض منافقت ہے۔ ان حالات میں ڈاکٹر صاحب کا مسیحیت کو دنیا کی سب سے بڑی تہذیب کہنا اور اس کے مقابلے میں مغربی تہذیب کو حقیر قرار دینا سمجھ سے بالاتر ہے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات بہت اچھی ہے کہ انہوں نے چین، روس، جاپان اور سابقہ سودیت یونین کے سوشلزم سے متاثرہ ممالک (پولینڈ، ہنگری، چیکوسلوواکیہ، یوکرین

وغیرہ) کو بھی مغربی تہذیب کا ایک رخ قرار دیا ہے اور اسے یورپ وامریکہ تک محدود نہیں رکھا جبکہ یہ بات عام لوگوں پر واضح نہیں ہے۔

۳۔ جس طرح ڈاکٹر گیلانی صاحب مغربی فکر وتہذیب کے بارے میں یہ نہیں کہتے کہ وہ خلاف اسلام ہے یا مغربی تہذیب کے علمبردار ممالک کے بارے میں یہ نہیں کہتے کہ وہ اسلام اور مسلم دشمن ہیں اور یہ بھی نہیں کہتے کہ مسلمانوں کو اس الحادی اور بے دین تہذیب کو رد کر دینا چاہیے اور اس کی پیروی چھوڑ کر مخلصانہ اسلام کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اور اس کے اجتماعی ادارے (سیاسی نظام، معاشی نظام، عدالتی نظام وغیرہ) قائم کرنے چاہئیں.... یہی رویہ ان کا 'قومی ریاست' (Nation state) کے حوالے سے بھی ہے۔ قومی ریاست کا تصور مغرب میں کیسے وجود میں آیا اور اس نے مغربی تہذیب کو موجودہ الحادی اور لادینی کردار کی طرف کیسے موڑا؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

i۔ ''سولھویں صدی کے یورپی براعظم سے عالم گیر عیسائیت نے چند اہم قومی بادشاہتیں پیدا کیں۔ اسی دوران عیسائیت کے اندر ایک مذہبی بغاوت کے نتیجے میں پروٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوگیا۔ قومی بادشاہتوں نے اس تفریق کے نتیجے میں اپنے آپ کو عیسائیت کے ایک یا دوسرے گروہ سے منسلک کر کے اسے اپنی شناخت بنالیا۔ اس طرح عالم گیر عیسائی شناخت، قومی شناختوں میں بکھر گئی۔ گویا ابتدا میں مذہب کی قومی شناخت ایک یورپی تصور تھا، لیکن جلد ہی قومی بادشاہتوں نے دین کو اپنے ماتحت بنالیا۔ رفتہ رفتہ یہ نئی شناخت انسانوں کی طویل المدت دینی شناخت کی ایک اہم حریف بن گئی۔

یورپ کے دورِ استعمار میں یہ تصور نوآبادیاتی علاقوں میں متعارف ہوا اور جب استعمار رخصت ہوا تو نئے سیاسی ادارے اسی بنیاد پر قائم ہوئے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے اختتام تک دنیا کی بیش تر آبادی میں قومی شناخت اوّل اور مذہبی شناخت ماتحت شناخت میں تبدیل ہوگئی۔

مختصراً یہ کہ اس نئی شناخت میں قومی ریاست کی اوّلیت کا تصور ابتداً ایک یورپی مذہب بیزار تصور تھا۔ جو رفتہ رفتہ دنیا بھر میں ایک انتظامی حقیقت میں تبدیل ہوگیا۔ اس انتظامی ادارے نے قوت کے تمام مراکز پر اجارہ داری حاصل کر کے لادینیت کو ایک عالم گیر تہذیب

بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالیہ تحقیق کے مطابق لادینیت کی عالم گیر تہذیب میں قومی ریاست کا تصور ایک بنیادی اور غیر متنازع تصور ہے۔" [صفحہ: ۶۲]

"الہامی ادیان یعنی عیسائیت اور اس کے ایک بے نام حریف کی پذیرائی اور قوت کے اداروں پر اس کی اجارہ داری نے قومی ریاست کی شناخت کی اوّلیت اور الحاد کے فلسفے کے مرکب سے جدید لادینی تہذیب کا نیا اضافہ کر دیا ہے۔" [صفحہ: ۶۳]

ii۔ "۱۵۰۰ء میں عیسائیت میں اصلاح کے خواہش مند طبقوں نے روایت کی پابند عیسائیت کے خلاف بغاوت کر کے اتباعِ ریاست و حکومت کو اتباعِ دین و کلیسا پر فوقیت دے ڈالی۔ اس انحراف کے نتیجے میں پروٹسٹنٹ یورپ نے مطلق العنان بادشاہت (Absolutist Kingship) کا راستہ اختیار کیا، جو رفتہ رفتہ جدید قومی ریاست پر منتج ہوا اور اسی دراڑ کے نتیجے میں عیسائیت کی کوکھ سے جدید عالم گیر لادینی تہذیب پیدا ہوئی۔" [صفحہ: ۷۸]

iii۔ "جدید قومی ریاست پر مبنی عالم گیر نظام (World Order) اپنی مالی اور جبری فوقیت کے بل بوتے پر دوسرے تہذیبی گروہوں کے اس اہم کردار کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ دنیا کے کسی اہم فورم پر ان کو اپنے ہم پلہ رکھنے کی بجائے نہ صرف زیر تسلط رکھتا ہے، بلکہ اگر قبول بھی کرتا ہے تو انتہائی حقیر استثنائی حیثیت میں۔ اس نے ایک منظم کوشش اور مختلف توجیہات کے تحت دنیا پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ وہ بڑی تہذیبوں کی شناخت تک کو ممنوع قرار دیتا ہے، حتیٰ کہ ان کی شناخت کو مردم شماری سے باہر رکھنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔" [صفحہ: ۸۱، ۸۲]

'قومی ریاست' کے اس مستبدانہ کردار اور اُس کی اِس حقیقت کو جاننے کے باوجود کہ اس نے مغرب کی الحادی اور لادین مغربی تہذیب کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے اور اس نے مسلمانوں میں ملت اور امت کے تصور کو (جو ان کی مرکزیت اور قوت کا مظہر ہے، مجروح کیا ہے اور اسے کسی طور ابھرنے نہیں دے رہا، ڈاکٹر صاحب نے اس کے لیے نہایت نرم رویہ اختیار کیا ہے اور اسے ردّ کرنے اور غیر اسلامی قرار دینے کی بجائے کہتے ہیں کہ:

"تاریخ کے اس مرحلے پر عالم گیر انسانی برادری کی تنظیم میں جدید قومی ریاست اور اس

کے بین الاقوامی تنظیمی ڈھانچے کے ایک جائز اور اہم مقام کو تسلیم کیا جا سکتا ہے، البتہ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے عقائد اور معاشرتی اقدار کو مال اور جبر کے زور پر پوری انسانیت پر نافذ کرنے کی روش کو ترک کر دے۔'' [صفحہ: ۸۲]

اور یہ بات بھی تعجب خیز ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے پیروؤں کو ایک امت نہیں کہتے جبکہ مسلمانوں اور مسیحیوں کو الگ الگ امت قرار دیتے ہیں، یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ ''ایک مشترکہ روحانی امت نہ ہونے کے باوجود جدید لادینی تہذیب میں ایک عالم گیر گروہی تعصب اور یکجہتی پائی جاتی ہے اور اس اسلامی تصور کے باوجود کہ "الکفر ملة واحدة"یعنی تمام عالم کفر ایک ملت ہے۔ نیز وہ اس طرف بھی اشارہ نہیں کرتے کہ مغرب کا قومی ریاست کا تصور اور دنیا پر اس کا زبردستی اطلاق اور مغربی تہذیب کے علمبرداروں کا عالمی غلبہ اسلام کے تصور امت وخلافت کا سب سے بڑا نقیض اور مخالف ہے اور وہ اسے کسی قیمت پر ابھرنے نہیں دیتا۔

۴۔ ڈاکٹر صاحب کے مضمون کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے 'مغربی تہذیب کیا ہے؟' کو کھول کر بیان کر دیا ہے اور یوں ان متجددین اور مغرب پرستوں کے غبارے سے ہوا نکال دی ہے جو تہذیب مغرب کی اسلامائزیشن کر رہے تھے یا اسلام کی ویسٹرنائیزیشن میں مشغول تھے اور مغرب سے مرعوب سادہ لوح مسلمانوں کو باور کراتے تھے کہ مغرب اس لیے کامیاب اور ترقی یافتہ ہے کہ وہ اسلامی اصولوں پر عمل کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اعداد وشمار پیش کیے ہیں کہ مغربی تہذیب کے ماننے والے ۷۵ فیصد لوگ خدا کو نہیں مانتے اور ۸۴ فیصد لوگ آخرت کے منکر ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ 'مغربی تہذیب' انسانوں کا وضع کردہ ایک دین ہے۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''بظاہر عالم گیر'لادینی تہذیب' دیگر عالم گیر دینی تہذیبوں کی شناخت کی پیمائش کو پسند نہیں کرتی اور نہ اپنے آپ کو ایک دین کے طور پر متعارف کروا کر اپنے پیروکاروں کی تعداد کی پیمائش کرتی ہے۔ یہ اس کے باوجود ہے کہ لادینیت کی اپنی 'ایمانیات' اور اقدار ہیں، اس کے اپنے معبود ہیں، اس نے انسانوں کے درمیان معاملات حتیٰ کہ خاندانی نظام کے بارے میں اپنے جدا طور اطوار کا ڈھانچہ تعمیر کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ اس بات کی خواہش مند ہے کہ تمام انسانوں کو

اپنے دین پر لاکر اپنی تعریف کے مطابق انہیں 'فلاح' سے ہمکنار کردے۔" [صفحہ: ۱۷]

۵۔ ڈاکٹر صاحب نے اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کے بارے میں جو باتیں کی ہیں وہ چونکا دینے والی ہیں اور دین دار مسلمانوں کو خصوصاً وہ جو اسلامی غلبے کے خواب دیکھتے ہیں، انہیں ان اعداد وشمار کو دکھ اور پریشانی سے دیکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب کے مہیا کردہ اعداد وشمار کے مطابق:

i۔ جو "مسلمان" خدا پر یقین نہیں رکھتے وہ ایک فیصد ہیں یعنی دو ارب مسلم آبادی میں سے ۲ کروڑ لوگ ملحد اور نیچری ہیں۔

ii۔ جو "مسلمان" آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ ۱۸ فیصد ہیں یعنی دو ارب مسلمانوں میں سے ۳۶ کروڑ مسلمان آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔

iii۔ جو مسلمان "دینی شناخت" کو دوسری شناختوں پر ترجیح دیتے ہیں ان کی تعداد ۴۹ فیصد ہے۔ مطلب یہ کہ دو ارب مسلمانوں میں سے ۵۱ فیصد لوگ یعنی ایک ارب دو کروڑ لوگ اپنی دینی شناخت کو دوسری شناختوں پر ترجیح نہیں دیتے۔

iv۔ صرف ۷۰ فیصد مسلمان اپنے بچوں کو دین دار بنانا چاہتے ہیں یعنی عالم اسلام کے دو ارب مسلمانوں میں سے ۶۰ کروڑ مسلمان ایسے ہیں جو اپنی اولاد کو دین دار نہیں بنانا چاہتے۔

v۔ ۲۷ فیصد مسلمان دین کی بجائے قومی ریاست کے تصور کو اپنی شناخت قرار دیتے ہیں یعنی دو ارب مسلمانوں میں سے ۵۴ کروڑ مسلمان قومی ریاست کو اپنی شناخت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

یہ اعداد وشمار الارمنگ ہیں اور جو تحریکیں اور مسلمان دین اور امت کا درد رکھتے ہیں یا دین کا غلبہ چاہتے ہیں، انہیں اپنی پالیسیاں اور دعوتی حکمت عملی ان اعداد وشمار کی روشنی میں تیار کرنی چاہیے۔

البرہان کے نام

* جدت اور جدیدیت - ترکی کے دینی مدارس

۱۔ البرہان شمارہ اپریل میں آپ نے اسلام، جدت اور جدیدیت والے مضمون میں لکھا ہے کہ ہم جدت کے مخالف نہیں، جدیدیت کے مخالف ہیں۔ جدت سے کیا مراد ہے مثلاً کورونا میں مساجد بند کرنا، ویکسین لگانا۔ یہ سب جدت ہے یا جدیدیت ہے؟

۲۔ عاصم حفیظ صاحب کا ترکی کے دینی مدارس والا مضمون پڑھ کر افسوس ہوا۔ کیا پندرہ سوسالہ مسلم تاریخ میں اسلامی علمیت اسی طرح پھیلی؟ کیا یہ ماڈل ہماری تاریخ کے مطابق ہے؟

(ابوعبداللہ کراچی)

البرہان

۱۔ جدت سے ہماری مراد تمدنی ترقی کے ایسے مظاہر ہیں جو مقاصد شریعت کے مطابق ہوں، ان کے خلاف نہ ہوں۔ جیسے جنگ میں گھوڑوں اور تلوار کی بجائے میزائل اور ٹینکوں کا استعمال۔ ذرائع آمدورفت میں گھوڑوں اور اونٹوں پر سفر کی بجائے کار، بس، ریل اور ہوائی جہاز کا استعمال۔ کچے راستوں پر چلنے کی بجائے سڑکوں کی تعمیر اور ٹریفک کے قوانین۔ تعلیم وتزکیہ کے لیے تعلیمی اداروں اور خانقاہوں کا قیام وغیرہ۔ یہ سب چیزیں نبی کریم ﷺ کے عہد میں موجود نہ تھیں، جدید ہیں، لیکن جائز ہیں۔

۲۔ ہمارے خیال میں مسلم علمی روایت یہی ہے کہ تعلیمی اداروں کو خود کفیل اور خود مختار (Autonomous) بنایا جائے تاکہ وہ آزادی سے تعلیم وتدریس وتحقیق کا کام کرسکیں۔ ساڑھے چودہ سوسالہ مسلم تاریخ میں حکمران، امراء اور معاشرہ مل کر خانقاہوں اور دینی مدارس کو خود کفیل بناتے تھے جو پرائیویٹ سیکٹر میں علماء کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ مالی نظام چونکہ زراعت پر مبنی تھا لہٰذا حکمران اکثر قریبی دیہات (یعنی ان کی پیداوار اور مالیہ) دینی مدرسہ یا

خانقاہ کے لیے وقف کر دیتے تھے تا کہ ان کے اخراجات پورے ہوتے رہیں۔ انہی اوقاف کی جدید صورت عصر حاضر کے Trust یا Endowment ہیں۔ آج کل اکثر بڑے دینی مدارس کے پاس اس طرح کے انڈومنٹ موجود ہیں اور جدید تعلیم میں ہائر ایجوکیشن کمیشن نے بھی ہر یونیورسٹی کے لیے انڈومنٹ کو ضروری قرار دے رکھا ہے اور اس کے بغیر کسی یونیورسٹی کو کام کرنے کا NOC نہیں ملتا۔

ہماری طالب علمانہ رائے میں دینی تعلیم کے فروغ کے لیے اسے دنیاوی لحاظ سے پرکشش بنانے میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ کیا محترم ابوعبداللہ صاحب چاہتے ہیں کہ دینی مدارس کے مہتمم حضرات ہمیشہ لوگوں سے چندے مانگتے رہیں (جو ان کے وقار کے صریحاً خلاف ہے) یا دینی مدارس کے اساتذہ قلیل تنخواہوں میں مسکینوں کی طرح گزارا کریں (کئی علماء پیٹ بھرنے کے لیے پارٹ ٹائم ٹیوشن پڑھاتے ہیں، بعض بخشیش پر گزارا کرتے ہیں اور بعض کمزور ایمان والے مجبوراً غیر شرعی حرکتوں پر اتر آتے ہیں)۔ لہٰذا پاکستان میں دینی مدارس کے چندہ سسٹم اور اساتذہ کی قلیل تنخواہوں کے نظام کو بدلا جانا چاہیے۔ اور اگر کوئی مسلم حکومت دینی تعلیم کے لیے کچھ انتظامات کرتی ہے جیسے ترکی میں ہے، تو اس کی تعریف کی جانی چاہیے نہ کہ مذمت۔ سادگی اور زہد قابل تعریف ہیں لیکن یہ 'دنیاداری' کے نقیض نہیں۔ کیا اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ ساری امت بھوکی ننگی رہے۔

ہمارے ہاں دینی مدارس کا ایک بڑا مسئلہ ہی یہ ہے کہ فارغ ہونے والے طلبہ روٹی کیسے کمائیں کیونکہ ہر طالب علم کو مسجد یا مدرسہ میں نوکری نہیں ملتی۔ سعودی عرب میں دینی جامعات کی ڈگریاں چونکہ دیگر یونیورسٹیوں کی طرح منظور شدہ ہیں لہٰذا انہیں پبلک یا پرائیویٹ سیکٹر میں جاب ملنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

* امیج کلچر

اپریل کے البرہان میں جناب مکرم محمود صاحب نے ''امیج کلچر'' میں معاشرے میں ''تصویر'' کی بھرمار کا رونا روکر مایوسی کا اظہار کیا ہے حالانکہ، اسلام اور اہل دین کو موجودہ دور کی ''تصویری'' بھرمار سے گھبرانے اور خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ مسلمان کے ایمان کی

ابتدا ہی ’’بالغیب‘‘ سے ہوتی ہے اور اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت (ذاتِ باری) نہ کبھی تصویر کی شکل میں سامنے آئی، نہ اس جہان میں آئے گی۔ چنانچہ امیج کلچر ایک مسلمان کے ایمان کا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا۔

اس کے برعکس، انٹرنیٹ اور یوٹیوب دینی معلومات کا ایک سمندر ہمیں مہیا کرتے ہیں جس سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہمارے زیادہ تر علماء اس سے خوفزدہ ہیں اور یہ کہہ کر اس کے فوائد کو مسترد کر دیتے ہیں کہ اس میں جھوٹ بھی شامل ہوتا ہے لیکن یہ ملاوٹ تو کثرت سے ہمیں ’’دکاندار علماء‘‘ کی تقریروں میں بھی ملتی ہے جو فرقہ پرستی کی اصل جڑ ہے۔ (یامین خالد، لاہور)

* البرہان دینی، دعوتی، تحریکی و تعلیمی دائروں کے لیے ایک متوازن، بے ساختہ اور بے لاگ مجلہ ہے جس کے کسی نقطۂ نظر سے اختلاف بھی ہو تو ڈاکٹر صاحب کا اخلاص اور دل سوزی دل میں جگہ بنا لیتی ہے۔ دعوت و تعلیم سے وابستہ ہر فرد کے لیے اس میں فکر و نظر کی تازگی اور رہنمائی کا سامان موجود پاتا ہوں۔ (زاہد اقبال، قرطبہ اسلامک سینٹر، اسلام آباد)

بقیہ: شریعت سیکولرزم، جمہوریت اور بنیادی حقوق کی مخالف ہے

خلاصہ یہ کہ رفاہ کی پالیسی ’جمہوری معاشرے‘ سے مطابقت نہ رکھتی تھی اور اقتدار ملنے کی صورت میں وہ اسے عملی جامہ پہنا سکتی تھی لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ آئینی عدالت نے پارٹی پر جو پابندی لگائی وہ ’’Pressing Social Need‘‘ کی رو سے جائز تھی یعنی معاشرتی حالات کا ایسا شدید دباؤ موجود تھا کہ پارٹی کے حق آزادیٔ اجتماع پر پابندی لگائی جا سکتی تھی۔

(b) سزا کا متوازن ہونا

تین مرکزی عہدیداروں کے سوا رفاہ پارٹی کے باقی ماندہ ارکان پر پابندی نہیں لگائی گئی اور وہ پارلیمنٹ کے رکن رہے۔ پارٹی کے اثاثے جو ضبط کیے گئے وہ معمولی مالیت کے تھے۔ نیز قائدین پر جو پابندی لگائی گئی وہ بھی محدود مدت کے لیے تھی اس لیے سزا متوازن تھی۔

لہٰذا ہمارا متفقہ فیصلہ ہے کہ آئینی عدالت کا فیصلہ صحیح تھا اور اس میں کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔